کالے پیڑوں کا جنگل

کالے دیووں کا سایہ

دوسرا ایڈیشن



ڈاکٹر ریاض توحیدیؔ

(1) کالے پیڑوں کا جنگل

(2) کالے دیوؤں کا سایہ

(دوسرا ایڈیشن)

ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری

نام کتاب: کالے پیڑوں کا جنگل (پہلا ایڈیشن 2011ء)
کالے دیوؤں کا سایہ (پہلا ایڈیشن 2014ء)
دوسرا ایڈیشن: 2019ء
مصنف: ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری
باہتمام:
قیمت:
ناشر: میزان پبلیشر زبٹہ مالو سرینگر کشمیر 190009
Mob: 9419002212

....

(ان کتابوں میں شامل افسانوں کے سبھی کردار، کہانیاں اور واقعات فرضی ہیں۔ کسی قسم کی مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی، جس کے لئے مصنف یا ناشر ذمہ دار نہیں ہوگا۔)

مصنّف

کوائف

نام : ڈاکٹر ریاض احمد بٹ

قلمی نام : ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری

پیشہ : لیکچرار (محکمہ تعلیم جموں وکشمیر)

پیدائش : یکم دسمبر 1973ء

موبائیل : 7006544358

ای میل : drreyaztawheedi777@yahoo.com

پتہ : وڑی پورہ ہندوارہ کشمیر 193221 (انڈیا)

تعلیم : گریجویشن :1999ء گورنمنٹ ڈگری کالج ہندوارہ

: ایم،اے (اردو) : 2002ء شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی

: ایم، فل : 2004ء اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی

پی۔ایچ۔ڈی: 2007ء اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی

ایوارڈ : گولڈ میڈل: 2009ء (اقبالیات)

تصانیف :–

(۱) جہانِ اقبالؔ (تحقیق ،تنقید)...2010ء

(۲) کالے پیڑوں کا جنگل (افسانے)۔۔۔۔2011ء

(۳) ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم بحثیت اقبالؔ شناس (تحقیق وتنقید) 2013ء کشمیر

دوسرا ایڈیشن عکس پبلکیشن پاکستان.....2018ء

(۴) کالے دیوؤں کا سایہ (افسانے)۔۔۔۔2014ء

(۵) معاصر اردو افسانہ تفہیم وتجزیہ (تنقید).....2018ء

زیر ترتیب

(۱) کالے بھوتوں کا بسیرا (افسانے)

(۲) گھوڑے سے گنڈولہ تک (طنز ومزاح)

(۳) معاصر اردو افسانہ تفہیم وتجزیہ (جلد دوم)

(۴) اسے کہنا کہ دسمبر آیا ہے (شاعری)

(۵) تفہیم شاعری (تنقید)

Dr. Reyaz-Tawheedi
Address:-Wadipora-Handwara-kashmir193221(India)
Mobil:-9906834877..7006544358

email-drreyaztawheedi777@yahoo.com

کالے پیڑوں کا جنگل

(افسانے)

انتساب

وَادیٔ گلپُوش کے اُن ریشم مزاج بلبلوں

کے نام

جو کالے پیڑوں کے جنگل کے درمیان

کالے دیوؤں کے سایوں میں بھی چہچہاتے رہتے ہیں۔

فہرست

......

تبصرے/تجزئے

فسانہ دیکھ ذرا...!

مجھے پریوں کی یہ جھوٹی کہانی مت سناؤ تم
میں اپنی آنکھ کے اندر کئی کوہ قاف رکھتا ہوں

(سہیل احمد)

افسانوی سفر......سوچ کی پرواز کا تخئیلی سفر ہوتا ہے۔ یہ سفر ذاتی تجربے، خارجی مشاہدے اور قوت تخیل کے وسیلے سے جاری رہتا ہے۔ انسان کی زندگی بذاتِ خود ایک کہانی ہے۔ یہ کہانی پیدائش سے لے کر موت تک کے سفر پر مشتمل ہوتی ہے۔انسان سے ہی قوم بنتی ہے اس لئے قوموں کی بھی اپنی ایک کہانی ہوتی ہے جوان کے عروج وزوال پر مبنی ہوتی ہے۔ایک قلم کار بھی ایک قوم کا فرد ہوتا ہے۔اب تو گلوبل ویلیج کا زمانہ ہے اسلئے دنیا کے کسی بھی خطے کی صورتحال سے انسان باخبر رہتا ہے اور خود کو اس صورتحال کے نتائج سے جڑتا محسوس کرتا ہے۔اس تناظر میں دیکھیں تو ان کتابوں میں شامل بیشتر کہانیاں میری اس ستم رسیدہ قوم کی آہوں اور سسکیوں کی المناک داستان سُنا رہی ہیں اور ساتھ ہی کئی افسانے عالمی مسائل اور سیاسی وسماجی صورتحال کی فنی عکاسی بھی کر رہے ہیں۔اس لئے کتب میں شامل افسانے مقامی سطح سے لیکر عالمی سطح کے موضوعات ومسائل کا احاطہ کرتے نظر آئینگے۔کیونکہ ایک تخلیق کار کا وژن محدود نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اس کی تخلیق عصری حسیت کی عکاسی کی حامل ہو۔

معزز قارئین کرام:

میرا پہلا افسانوی مجموعہ ’’کالے پیڑوں کا جنگل‘‘ 2011ء میں شائع ہوا تھا اور دوسال بعد دوسرا مجموعہ ’’کالے دیوؤں کا سایہ‘‘ 2014ء میں منظر عام پر آیا۔اب چونکہ دونوں کتابیں مارکیٹ میں دستیاب نہیں ہیں اور کافی تعداد میں قارئین کا ذوق دیکھ کر اب دونوں کتابوں کا ایک ہی ایڈیشن نکالنے کا خیال آیا تا کہ شائقین افسانہ کو بہ آسانی دونوں مجموعے ایک ساتھ مل سکیں۔اصل میں اس جانب پبلیشر جناب شبیر صاحب نے توجہ دلائی کہ کتابوں کی ڈیمانڈ دیکھ کر نیا ایڈیشن نکالا جائے۔میزان پبلیشرز سرینگر کشمیر نہ صرف فروغ اردو زبان وادب میں اہم کردار ادا کر رہا ہے بلکہ اردو کتابوں کی اشاعت میں بھی نمایاں مقام رکھتا ہے‘تو مشورہ سن کر راقم نے چند مہینے کی مہلت طلب کی تا کہ کتابوں کی پروف ریڈنگ اور املائی اغلاط کو درست کر سکوں۔چونکہ جس وقت یہ کتابیں کمپوز ہوئی تھیں‘اس وقت کمپوزنگ سے نابلد ہونے کی وجہ سے تصحیح کی طرف کچھ خاص توجہ نہ دے سکا تھا‘اس لئے اب بہت حد تک مطمئن ہوکر یہ ایڈیشن شائع کرنے جارہا ہوں۔امید ہے کہ قارئین کرام محبت سے نوازیں گے۔ان سبھی احباب اور شبیر صاحب کا شکریہ‘جن کی محبتوں اور مشوروں سے یہ ایڈیشن نکالنے کی تحریک ملی۔

ہم درد کا افسانہ دنیا کو سنادیں گے

ہر دل میں محبت کی اک آگ لگادیں گے

(شکیل بدایونی)

شکریہ

محبتوں کا طالب

ریاض توحیدی

ماں

وہ اوندھے منہ زمین پر گر کر ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ جن بچوں کے ساتھ وہ کھیل کود میں مشغول تھا وہ خوفزدہ ہو کر دوڑتے ہوئے اُس کے گھر گئے اور اُس کی ماں کو ساتھ لے آئے۔ ماں نے جب روتے روتے اپنے دوپٹے سے اس کے جھاگ بھرے منہ کو صاف کیا تو وہ تھوڑی دیر بعد پھر سے اپنے حواس میں آ گیا۔ ماں اُسے گھر لے آئی اور کھانا کھلاتے ہوئے سمجھانے لگی کہ کتنی بار تجھ سے کہا کہ گھر سے باہر مت نکلا کر، ابھی تو ٹھیک نہیں ہوا ہے۔ جب اچھی طرح ٹھیک ہو جائے گا تو تو بچوں کے ساتھ کھیل بھی سکے گا۔ اُس پر ماں کی باتوں کا کچھ اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنی بیماری سے بےخبر تھا۔ اُسے جب بھی مرگی کا دورہ پڑتا تھا تو اُس کے منہ سے جھاگ نکلنا شروع ہو جاتا اور وہ گر کر ہاتھ پاؤں سے زمین کھودنے لگتا۔ وہ بیس برس کا ہونے کے باوجود بھی بچہ تھا اور چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلتا رہتا۔ اور جب وہ کبھی دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے گھر نہیں جاتا تو اُس کی ماں اسے ڈھونڈتی پھرتی کھیل کی جگہ پہنچ جاتی اور اُس کے بازو پکڑ کر گھر لے جاتی۔ دیہاتی ہونے کی وجہ سے والدین نے اُس کی بیماری کی طرف کم ہی توجہ دی۔ وہ پیروں، فقیروں کے پاس تو جاتے تھے لیکن اس کا میڈیکل علاج نہیں کرواتے تھے۔ وہ لوگ جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتے تھے کیونکہ اُس دور دراز دیہات میں شاید ہی کوئی انسان جدید طریقہ علاج سے آشنا تھا۔ وہاں پر

نہ تو کوئی ہیلتھ سنٹر تھا اور نہ ہی کوئی فرد جدید میڈیکل سہولیات سے واقف تھا۔ یہ لوگ روایتی اندز میں بیماریوں کا علاج کرنے کے عادی تھے۔ان لوگوں کے اکثر بچے پولیو اور ٹی. بی جیسی مہلک بیماریوں کے شکار ہوجاتے تھے۔توہمات اور لاعلمی کی وجہ سے یہ لوگ ان بیماریوں خاص توجہ نہیں دیتے تھے۔

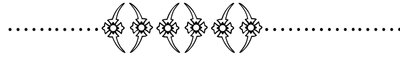
تہوار کی صبح والدین نے اُسے نہلا دھلا کر نئے کپڑے پہنائے۔وہ کھانا کھا کر بچوں کے ساتھ کھیلنے کے لئے میدان کی طرف چل پڑا۔میدان میں ڈھول بج رہے تھے۔ بچے ڈھول کی نال پر ناچ رہے تھے۔وہ بھی ناچنے لگا اور ناچتے ناچتے اپنے کپڑے پھاڑنے لگا۔چند ہی لمحوں میں اُس پر دورہ پڑا اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔کچھ لوگوں نے اُسے اٹھایا اور اُس کے گھر کی طرف لے چلے۔گاؤں کا ایک لڑکا ’جو کہ شہر میں پڑھ رہا تھا‘ بھی اُس کے گھر چلا گیا اور اُس کے گھر والوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ شہر جا کر کسی اچھے ڈاکٹر سے اس کا علاج کرائیں۔کچھ دنوں کے بعد والدین اُس لڑکے کے ساتھ شہر کے ایک ماہر ڈاکٹر کے پاس چلے گئے۔ڈاکٹر نے جب اسکا مکمل چک اپ کیا تو وہ مایوس ہوکر انھیں سمجھانے لگا کہ آپ لوگ بڑی دیر سے آئے۔اس کے سر کی نسیں کمزور پڑ گئی ہیں اور یہ نشانی پاگل پن کی نشانی ہوسکتی ہے۔ڈاکٹر نے انھیں معمولی دوائیاں لکھ کر دیں اور وہ مایوس ہوکر گھر کی طرف لوٹ پڑے۔

ماں اب اُسے گھر سے باہر نکلنے نہیں دیتی تھی۔اُس پر اب مہینے میں تین چار بار پاگل پن کا دورہ پڑتا تھا۔دوا کا بھی اُس پر کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔ماں ہر طرح سے اُسکا خیال رکھتی تھی۔لیکن جب وہ اپنی زندگی کی آخری سانسیں گننے لگی تو اُس نے اپنے دوسرے بیٹوں سے منت سماجت کی کہ وہ اپنے نیم پاگل بھائی کو کسی قسم کا دُکھ نہیں دینگے۔

ماں کے مرنے کے بعد اُس کی چھوٹی بہن اُس کا ہر طرح سے خیال رکھتی تھی۔ وہ اُس کے کپڑے دھوتی ' اُسے صاف رکھتی اور وقت پر اُسے کھانا کھلاتی رہتی۔ بہن کی شادی کے بعد وہ اکیلا پڑ گیا۔ بھائیوں نے جب شادیاں کیں تو وہ اُس کی طرف کم ہی توجہ دینے لگے۔ ایک دن گھر کا بٹوارہ ہو گیا۔ بھابیوں نے الگ الگ چولہے جلائے۔ گھر کی تمام قیمتی جائیداد کی تقسیم تو ہوگئی لیکن اس بے قیمت شئے کو کسی نے بھی نہیں اپنایا۔ اُس کا بوریا بستر ا بکریوں کی رہنے کی جگہ ایک اندھیرے جھونپڑے میں رکھا گیا اور اپنی اپنی باری پر اُسے کھانا دیا جاتا۔

تہوار کا دن تھا۔ ہر طرف خوشی کا ماحول تھا۔ اُس کی بھابیاں طرح طرح کے لذیذ کھانے اپنے اپنے بچوں کو کھلاتیں رہیں۔ اُس کی طرف کسی کا بھی دھیان نہیں گیا۔ وہ دن بھر بھوکا پیاسا اندھیرے میں پڑا رہا۔ جب اُسے بھوک نے زیادہ ستانا شروع کیا تو اُس نے بکری کے تھن سے اپنا منہ لگایا اور دودھ پینا شروع کر دیا۔ اس کچے دودھ کی وجہ سے اُسے بخار چڑھ گیا اور اس کا بدن جلنے لگا۔ رات کے وقت جب اُس کی ایک بھابی بکری کا دودھ دوہنے آئی تو تھن خالی پا کر اُس نے فرش پر دودھ کی چھینٹیں دیکھی۔ اُس کے نزدیک جا کر جب اُس نے سمجھا کہ دودھ کہاں غائب ہو گیا ہے تو اُس نے غصے میں آ کر بالٹین اُس کے سر پر زور سے مارا اور بک بک کرتی ہوئی وہاں سے نکل گئی۔ اس نیم پاگل کے سر سے خون بہنے لگا۔ آدھی رات تک وہ زخمی حالت میں تڑپتا رہا اور جب سب لوگ سوئے ہوئے تھے تو اُس پر پاگل پن کا دورہ پڑنے لگا۔ وہ اندھیری رات میں قبرستان کی طرف کپڑے پھاڑتے ہوئے چلا گیا۔ ماں کی قبر پر پہنچ کر وہ زور زور سے رونے لگا۔ وہ اپنی زخمی روح کو سکون دینے کے لئے ماں کی قبر سے لپٹ گیا۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ بچپن کی طرح ماں کی گود

میں بیٹھا ہوا ہے اور ماں اُسے سُلانے کے لئے لوری سُنا رہی ہے۔ اُس پر آہستہ آہستہ نیند کا غلبہ ہونے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس کے ہاتھ پیر ہلنے لگے اور دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ اُس کی آنکھیں اچانک کھل گئیں اور اُس کے منہ سے جھاگ کے ساتھ آخری بار نکل پڑا...... ماں............!!



گلوبل جھوٹ

''ذہنِ انسانی، احساس کی سرد و گرم لہروں سے ہی غور و فکر کے ساحلوں سے ٹکراتا رہتا ہے'' وہ سنجیدگی سے میرے سوال کا جواب دے رہا تھا۔ ''اور فکری سطح پر انسان، احساس برتری کی گرمی یا احساس کمتری کی سردی کا اسیر رہتا ہے۔''

''آج پھر تیرے فلسفیانہ افکار کے بار نے میری ناتواں سوچ کو داب کر رکھ دیا'' میں نے اُسے مذاقاً چھیڑا۔ ''میرا سوال تو آسان تھا''

''نہیں! انٹرنیٹ مائنڈ......تم کسی بڑے مسئلے کو بھی خارجی سطح پر سمجھنے کی کوشش کرتے ہو۔'' اُس نے دھیمے لہجے میں کہا ''جب قوموں کے اتار چڑھاؤ کا مسئلہ سامنے آتا ہے تو اس پر دو اور دو کا چار والا ریاضی فارمولہ نہیں چلتا ہے بلکہ اس کے لئے داخلی سطح پر سوچنے سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔''

ہمارے درمیان جب بھی کسی مسئلہ پر گفت و شنید ہوتی ہے تو میرا فلسفی دوست، ایوان فلسفہ کی بلندی سے اپنے سرد و گرم افکار کی ہوائیں چھوڑتا رہتا ہے اور مجھے اس کے حکیمانہ نکتوں کی تہہ تک پہنچنے کے لئے فکر کی کئی سرحدوں کو پھاندنا پڑتا ہے۔ ''فخر کرنے کے اعتبار سے ہم لوگ اگرچہ دوسرے لوگوں سے کئی قدم آگے ہیں'' میں نے ایک حساس سوال اُس کے سامنے رکھ دیا ''تو پھر ہم کیوں دنیا کے گوشے گوشے میں

احساس کمتری کے شکار نظر آ رہے ہیں۔''

''ہم لوگ حال کو بھول کر ماضی پر فخر کرتے ہوئے اپنے مستقبل کو بھی فراموش کر رہے ہیں۔'' وہ میری طرف سے بڑے غور سے دیکھتے ہوئے بول پڑا۔''موجودہ دور کی دھماکہ خیز علمی دنیا میں اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرنے کے لئے سادگی کے ساتھ ساتھ چالاکی اور بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت کی بھی ضرورت ہے' نہیں تو سادہ ذہن انسان نئے دور کے خیر وشر اور مکر وفریب کی نئی نئی اصطلاحوں کے امتیاز سے قاصر رہے گا۔'' اُس کی یہ فکر انگیز باتیں سنتے سنتے میں نے چائے کی پیالی اُس کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا کہ احساسِ کمتری کے اس دلدل سے نکلنے کے لئے کونسی کمند کار گر رہے گی؟''ہمارے ذہن تقلید پسندی کے اسیر ہو چکے ہیں'' وہ چائے کی چسکی لیتے ہوئے گویا ہوا۔'' ہماری سوچ پر جمود چھایا ہوا ہے ہمیں اجتہادی فکر اور متحرک سوچ سے کام لینا پڑے گا۔'' اُس کی یہ تجسس آمیز باتیں سُن کر میں سوچنے لگا کہ کسی معاملے کو بہتر طور پر سمجھنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اُس معاملے کے متعلق اُسی انسان سے صلح مشورہ کرنا چاہئے جو معاملہ فہم ہونے کے ساتھ ساتھ اُس معاملے کے تمام پہلوؤں کا گہرا شعور رکھتا ہو۔نہیں تو اناڑی سوچ کا حامل انسان اناڑی مشوروں سے ہی نوازے گا۔

اُس کی دل پذیر باتوں نے میرے ذہن کے دریچے کھول دیئے اور میں خیالات کے سمندر میں غرق ہوگیا کہ ہم ایک درخشاں تہذیب کی پروردہ نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارا تابناک ماضی دوسرے اقوام کے لئے نشانِ راہ ثابت ہوا تھا اور وہ ڈارک ایج سے نکل کر برائٹ ایج میں آن پہنچے' برعکس اس کے ہم برائٹ ایج کے بنیاد گزار ہونے کے باوجود فکری طور پر ڈارک ایج میں بسنے والوں کی سی زندگی

گزار رہے ہیں۔ ہم مفتوح...... ہماری سوچ مفتوح......اور کرمپو مائزڈ سوچ والے انسان بھی فکری مفلسی کا شکار نظر آ رہے ہیں۔

اُس نے مجھے خیالات میں غرق پا کر آواز دی ''کہاں کھو گئے؟'' اُس کی آواز سن کر میں چونک گیا اور اُسے کہنے لگا کہ میں سوچ رہا ہوں کہ ''ہم اپنی کمزوریوں کو کب سمجھنے اور انھیں دور کرنے کی کوشش کرینگے؟'' ''تم کن کمزوریوں کی بات کر رہے ہو؟'' وہ پوچھ بیٹھا۔ ''ہمیں ہر طرح سے دبایا جا رہا ہے۔'' میں بے قراری میں کہہ اٹھا ''ہمیں روز بہ روز کمزور بنایا جا رہا ہے۔'' وہ تھوڑی دیر خاموش رہا اور پھر کہنے لگا۔ ''تم جس حقیقت کو کمزوری سمجھ رہے ہو وہ اصل میں ہماری خامیاں ہیں۔'' ''ہماری خامیاں'' میں حیران ہو کر بول پڑا۔ ''وہ کیسے؟'' ''ہمارے آفاقی دستور میں ہمیں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کے مانند متحد رہنے کا اصول بتایا گیا ہے اور ہم ہر جگہ فرقوں...... مسلکوں اور انانیت کے تباہ شدہ کھنڈروں میں پھنسے ہوئے ہیں'' یہ کہتے ہوئے وہ کمرے میں چہل قدمی کرنے لگا۔

''ہم نے آفاقی پیغام کا مغز چھوڑ کر صرف چھلکے بانٹنے میں ہی اپنی سوچ اور طاقت کو لگا دیا ہے اور ہر گروہ عصری تقاضوں سے بے خبر اپنے حصّے کے چھلکے کو اصلی مغز قرار دے رہا ہے۔''

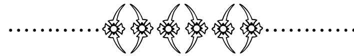
اُس کی حکیمانہ باتوں سے میرے ذہن پر پڑے بے خبری کے دبیز پردے آہستہ آہستہ چاک ہونے لگے۔ ''اس اندھیرے سے نکلنے کی کوئی روشن کرن بھی موجود ہے۔'' میں استفہامیہ انداز سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ ''ہاں'' وہ ہاتھوں کو اوپر اٹھاتے ہوئے پکار اٹھا ''ہمیں اپنے ارد گرد چھائے ہوئے جمودی غلاف کو اجتہادی تلوار سے پھاڑ ڈالنا ہوگا اور متحد ہو کر متحرک سوچ کے ساتھ آگے قدم بڑھانا

ہوگا۔''

''اس وقت تو عالمی سطح پر چند دماغ اس مقصد کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔'' میں نے سنجیدگی کے انداز میں کہا ''لیکن انھیں دہشت گرد یا دہشت پسند جیسے القاب سے نوازا جارہا ہے۔''

''جس جدوجہد کی طرف تم اشارہ کر رہے ہو وہ نیند میں چلنے جیسا عمل ہے۔'' وہ کرسی پر بیٹھ کر مجھے سمجھانے لگا۔''لیکن اس جدوجہد کے پیچھے بڑے باخبر اور ہوشیار ذہن کام کر رہے ہیں تاہم اس تحریک سے وابستہ زیادہ تر افراد فکر وتدبر سے عاری صرف جذباتی سوچ کے حامل دکھائی دے رہے ہیں۔اس تحریک کو فکر وتدبر کے ساتھ آگے بڑھانے کی ضرورت ہے اور عصری تقاضوں کے مطابق زندگی کے ہر شعبے میں سبقت لینے کی ضرورت ہے۔'' وہ چند منٹ خاموش رہنے کے بعد میرے سوال کے دوسرے حصّے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''اور تم یہ جو'' دہشت گردی'' کی جدید اصطلاح کی بات کر رہے ہو۔''اصل میں یہ عصر حاضر کے طاقت ور حیوانوں کا ایک ایسا گلابل جھوٹ ہے جسے وہ جمہوریت کے فروغ کے بہانے مصنوعی سچ بنا کر بیدار ذہن انسانوں کی بیداری پر روک لگانے کے لئے استعمال کر رہے ہیں تاکہ وہ اپنے بے لگام پاور کی دہشت گردی سے دنیا کے کمزور اور بے بس انسانوں کو جمہوریت پسند غلام بنا سکیں۔''



سنگ باز

شُتر بے مہار کی گھنٹی کی ڈراونی آواز نے پھر اُس کے کان کے پردوں کو پھاڑتے ہوئے اُس کی خوف زدہ نیند پر شبخون مار کر اُس کے سکون بھرے گھروندے کو توڑ پھوڑ ڈالا۔شب دیجور کے بھیانک سائے میں ''ماں! ان ظالموں نے اُسے گولی ماردی......وہ زخمی حالت میں سڑک پر اُن سے زندگی کی بھیک مانگ رہا ہے ......ماں وہ تڑپ تڑپ کر رورہا ہے......ماں وہ بے بسی کی حالت میں جان دے رہا ہے......'' کہتے ہوئے گلستان اپنے بیڈ سے گھبرا کر اٹھا اور ماں کی چھاتی پر سر مار مار کر سسکیاں بھرنے لگا۔ماں کی نیند اچانک ٹوٹ گئی۔''گھبراؤ مت میرے لال' گھبراؤ مت! سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' کہتے ہوئے وہ خود بھی رو پڑی اور ''ہمارا خدا ان قاتلوں سے تمہارے معصوم دوست کے قتل کا بدلہ ضرور لے گا۔'' کا دلاسہ دیتی ہوئی آنسو بہاتے بہاتے اُس کے سر کو اپنے شفقت بھرے ہاتھ سے ستارۂ سحری تک سہلاتی رہی۔

پندرہ برس کا طالبِ علم گلستان خان جب بھی اس شبِ سُرخاب کی طغیانی میں اپنی غمگین سوچ کو نیند کے تلخ سمندر میں ڈبونا چاہتا تو ان ہی کرب زدہ لمحوں میں ان ستیزۂ چشم بھگت باز درندوں کی آگ برساتی گولیوں کا وہ دہشت ناک خونین منظر خوفناک زلزلہ بن کر اُس کے نازک ذہن کی نازک سوچوں اور اس کے شیشۂ دل کے

حسین سپنوں کو چکنا چور کر کے رکھ دیتا تھا، جس میں اُس کے سامنے....دن کے اُجالے میں.... اُس کے سولہا برس کے معصوم دوست بوستان شاہ کے نرم و نازک گلابی بدن کو سیاہ پوش درندوں کی زہریلی گولیوں نے پرزہ پرزہ کر کے رکھ دیا تھا اور اُس کا معصوم دوست گولیاں کھاتے کھاتے خون آلودہ ہاتھوں سے اپنے اسکولی بیگ سے کتابیں دکھا دکھا کر ان سنگ دل جلادوں کو اپنی بے گناہی کا ناکام وشواش دلا رہا تھا۔

پچھلی کئی دہائیوں سے جنتِ کشمیر کے نہ جانے کتنے ہی خوشبودار پھول، معصوم بوستان شاہ کی طرح آبدیدہ نگاہوں میں سجائے ہوئے رنگ برنگے خوابوں کی تعبیر دیکھے بغیر ہی اپنی تلخ بھری یادیں وطن کی شبنمی پلکوں پر چبتے کانٹوں کی طرح چھوڑ کر چلے گئے، اور نہ جانے کتنے ہی گلابی پھولوں کو وہ سیاہ بخت جابر گلچیں، کھلنے سے پہلے ہی مسل کر رکھ دینگے۔

گلستان اور بوستان ایک ہی اسکول میں زیرِ تعلیم تھے۔ ہم جماعت اور ہم مزاج ہونے کی بدولت دونوں میں مثالی دوستی قائم تھی۔ گلستان کا خواب ڈاکٹر بننے کا تھا اور بوستان انجینئر بننے کا سپنہ دیکھتا رہتا۔ ایک روز ''یوم امن'' منانے کے موقع پر امن گروپ کی طرف سے، اسکول کے احاطے میں ''گڈ وِل'' پروگرام کے تحت اسکول کے طالب علموں کے لئے ایک سمینار کا اہتمام کیا گیا، جس کا موضوع تھا، ''میری زندگی کا مقصد''۔ دوسرے طالب علموں کے ساتھ ساتھ گلستان خان اور بوستان شاہ نے بھی تقریب میں حصّہ لیا۔ امن گروپ کے علاوہ سمینار میں دوسرے لوگ بھی طلبہ کی تقریریں دلچسپی سے سُن رہے تھے۔ گلستان خان نے موضوع کی مناسبت سے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''میری زندگی کا مقصد ڈاکٹر بننے کا ہے تا کہ میں اپنی قوم

کے ان ہزاروں زخمی افراد کا علاج کر سکوں جو رواں تشدد کی وجہ سے اپاہج بن گئے ہیں۔''اس طرح سے بوستان شاہ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ'' وہ ایک انجینئر بننے کا خواب دیکھ رہا ہے تا کہ وہ ان اپاہج افراد کے تباہ شدہ مکانوں کو دوبارہ تعمیر کرا سکے جنہیں تشدد کی آگ نے راکھ کا ڈھیر بنا ڈالا ہے۔'' دونوں دوستوں کی مثبت تقریروں پر اگر چہ لوگ خوش ہو کر تالیاں بجاتے رہے تاہم امن گروپ کی بدامن آنکھوں میں سُرخی پھیل گئی۔سیمینار کے اختتام پر گلستان اور بوستان کو بہترین کارکردگی دکھانے پر'' امن گروپ'' کی طرف سے'' تلاشِ امن'' نامی کتاب سے نوازا گیا۔

تقریب ختم ہونے کے بعد دونوں دوست پُرمسرت موڈ میں گھر کی جانب نکل پڑے۔سڑک پار کرتے ہی گلستان نے بوستان سے کہا کہ تم یہاں پر ہی انتظار کرو میں دکان سے چاکلیٹ لاتا ہوں۔ وہ ابھی چاکلیٹ ہی خرید رہا تھا کہ اچانک بغیر نمبر کی ایک سبز رنگ گاڑی بوستان کے نزدیک آ کر ٹھہر گئی اور چند نقاب پوش گاڑی سے اتر کر بوستان پر گولیاں چلانے لگے'بوستان گولیاں لگنے سے سڑک پر گر پڑا۔ یہ خونین منظر دیکھ کر جب لوگوں نے نقاب پوشوں سے گولیاں چلانے کا سبب پوچھا تو انھوں نے اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے پتھر دکھاتے ہوئے کہا'' یہ ہم پر سنگ باری کر رہا تھا......سنگ باز سالہ'' اُن کا جھوٹ سنتے ہی بوستان نے جان دیتے ہوئے اپنے اسکولی بیگ سے کتابیں نکال نکال کر کہا کہ'' میرے بیگ میں صرف کتابیں ہیں، پتھر نہیں......میں بے قصور ہوں......!''

لوگ جب بوستان کی لاش اٹھا کر حاکم الوقت کے مصنوعی دربار میں انصاف کی گھنٹی بجانے لگے تو ڈیوڑھی پر تعینات حاکم کے وفادار کارندوں نے انھیں یہ کہہ کر

وہاں سے بھگایا کہ ہماری عدالت کی ترازو میں کتابوں کے پلڑے کے اوپر پتھروں بھرا پلڑا بھاری پڑ گیا۔لوگ مایوس ہوکر بوستان شاہ کی لاش لے کر خاموشی کے ساتھ قبرستان کی جانب چل پڑے۔وہ قبرستان...جس پر کسی ظالم کا زور نہیں چلتا تھا اور جو کئی دہائیوں سے خاموشی کے ساتھ سینکڑوں مظلوموں کی لاشوں کو اپنی کشادہ گود میں سُلاتے آیا تھا۔

سالانہ امتحان کے ایام چل رہے تھے۔گلستان خان بھی بددلی کے ساتھ امتحان ہال میں بیٹھ گیا۔اُس کے سامنے جب دسویں جماعت کا امتحانی پرچہ ڈالا گیا تو کمرے میں ہر طرف اُس کے دوست کی مانوس آواز سے اُس کے کان بجنے لگے۔وہ آواز چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ دوست ہمیں سخت امتحان کا سامنا کرنا پڑے گا۔ہم ضرور کامیاب ہوجائینگے۔تمہیں ڈاکٹر بننا ہے اور مجھے انجینئر۔گلستان کے اندر عجیب قسم کی بے چینی پھیل گئی۔اُس کے ذہن نے سوچنا بند کردیا۔

اُسے ہر طرف خون آلودہ پتھر نظر آنے لگے۔وہ خاموشی کے ساتھ امتحان ہال سے باہر چلا آیا اور ''تلاش امن'' نامی کتاب میں پتھر چھپا کر سڑک کی جانب دوڑ پڑا ۔شُتر کمینہ کی گھنٹی بجتے ہی اُس کے کان بجنے لگے۔نوکیلے پتھر کی چوٹ سے امن گروپ کے سردار کے سیاہ ماتھے سے سُرخ خیلے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔نفرت کی تیز لہر نے بندوق کا گھوڑا دبایا اور آن کی آن میں گلستان کا گلابی بدن برستے شعلوں سے جلنے لگا۔وہ اپنے جلتے وجود کی پروا کئے بغیر غیرت کے گھوڑے پر سوار ہوا اور امن گروپ کے سردار کے جلادی چہرے پر ''تلاش امن'' نامی کتاب زور سے مارتے ہوئے بول پڑا۔

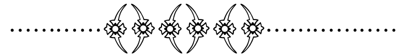
''مکار......دھوکے باز......کیا یہی ہے تمہارا فلسفۂ امن......؟ کہ نہتے لوگوں

کی فریادی سانسوں کو تشدد کی ننگی تلوار سے کاٹا جائے......اور......ان کے مضروب دل کی مجبور دھڑکنوں کو پھانسی کے پھندے سے جکڑ دیا جائے......!''

خون بہنے کے ساتھ ساتھ اُس کے جذبات بھی سرد پڑ گئے اور وہ لڑکھڑاتے ہوئے سڑک کے بیچوں بیچ زخمی حالت میں گر پڑا۔ بچوں نے جب گولیوں کی مانوس آواز سنی تو انھیں اپنی کتابوں میں لفظوں کے بدلے پتھر ہی پتھر نظر آنے لگے۔ وہ اسکول سے نکل کر بھاری بھاری بیگ ہاتھوں میں اٹھا کر دوڑتے ہوے سڑک پر آ گئے۔ گلستان کے خوشبودار خون کی مہک فضا میں پھیلنے لگی۔ لوگوں نے گلستان کو زخمی حالت میں اسپتال پہنچا دیا۔ ڈاکٹر رات بھر اُس کو بچانے کی کوشش کرتے رہے۔ اُس کی ماں رُو رُو کر اُس کے سر کو سہلاتی رہی۔ کالی رات کے آخری حصّے میں گھنٹی کی خوفناک آواز سے اُس کا دل بیٹھنے لگا اور اُس نے آخری مرتبہ ماں کی گود میں سر رکھ کر گھبرائی ہوئی آواز میں کہا:

''ماں...... مجھے میرا زخمی دوست علاج کے لئے بُلا رہا ہے......اُس کے جسم سے خون بہہ رہا ہے...... ماں...... مایوس مت ہونا......اندھیرا بھاگ رہا ہے......اور ......اور اُجالا آ رہا ہے......''

ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ پرندے پیڑوں پر خاموش ہو گئے اور اُس کی ماں کی قوت گویائی......!!!!



احتسابی جزیرہ

ایک دل فریب جزیرہ...... جہاں.....نہ کسی تہذیب کی پرچھائی تھی اور نہ ہی کسی مخلوق کا سایہ۔ رنگارنگ پھولوں اور قسم وار پھلوں سے سجا ہوا یہ خوبصورت وادی نما جزیرہ؛ بحرِ بےکراں کے قلب میں واقع تھا، مصنوعی روشنی کی زہریلی کرنوں سے آزاد...... پرُسکون فضاؤں کا مسکن......صدیوں بعد دریافت ہوا تھا۔شعور جب فکری طور پر غیر فطری سوچ کے دھوکے سے آگہی حاصل کرتا ہے تو وہ بصارت کے علاوہ بصیرت کا متلاشی بن جاتا ہے تاکہ اُس کی خام فکر، پختہ ہوکر روحانی سکون سے بھی لطف اندوز ہو سکے۔ دو تہذیبوں کی پروردہ نسلیں، خاموش پرندوں کی صورت میں جزیرہ کے سبزے پر الگ الگ قطاروں میں کھڑی تھیں۔ایک تہذیب کی نسل میں عمر رسیدہ مخلوق کا سہارا ان کے لمبے لمبے سایہ دار شجر تھے اور دوسری تہذیب کی عمر رسیدہ نسل خار دار جھاڑیوں سے مجروح ہو رہی تھی۔ دو پہاڑیوں کے اوپر دو درخت نظر آ رہے تھے۔ایک درخت کے اوپر سبز رنگ کا ایک کپڑا لہرا رہا تھا جس پر مشرقیت لکھا ہوا تھا اور دوسرے درخت کے سرخ کپڑے پر مغربیت لکھا ہوا تھا۔ دونوں درختوں نے اپنی اپنی جڑوں سے اپنی اپنی تاریخ کو باہر نکالا۔سبز رنگ کپڑے پر ”

روحانیت'' کا لفظ کا لکھا ہوا تھا اور سرخ رنگ کپڑے پر ''مادیت'' کا لفظ تھا۔

صدیوں کے تدبر کے بعد وقت نے ان دو تہذیبوں کے لئے یہ احتسابی جزیرہ دریافت کیا تھا کیونکہ یہ جزیرہ فطرت پسند تھا۔ مصنوعیت پرستی کی منطقی صنعت گری کے لئے یہاں پر کوئی گنجائش نہیں تھی اور نہ ہی یہاں پر جمودی فکر کی کوئی منطق کام آسکتی تھی۔ یہاں پر صرف فطرت کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ دونوں تہذیبیں اپنی اپنی پروردہ نسل کے نشیب و فراز کے احتسابی نتائج دیکھنے کے لئے بے چین ہو رہی تھیں۔

پہاڑیوں کے درمیان موجود ایک اونچے پہاڑ کے اوپر سبز پروں والا ایک بڑا پرندہ نمودار ہوا۔ اُس کے حلق میں ایک بڑا ترازو لٹک رہا تھا' اُس نے اپنی خوبصورت لمبی چونچ سے دونوں تہذیبوں کی تواریخ کو ایک ایک کر کے اٹھایا اور ترازو کے پلڑوں میں رکھا۔ اُس نے دونوں تہذیبوں کے پرندوں کو پہاڑیوں پر موجود درختوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ دونوں تہذیبوں کے پرندے اپنے اپنے تاریخی پیڑوں پر اجا بیٹھے۔ اُس نے اپنی لمبی چونچ سے دونوں تہذیبوں کی تواریخ کو ادوار کے حساب سے درختوں کی جڑوں پر پھینکنا شروع کر دیا۔ ابتدائی ادوار کو پھینکتے ہوئے اُس نے اعلان کر دیا کہ ہر دور کی سرد و گرم ہواؤں کے ساتھ تم داخلی اور خارجی نشیب و فراز کے احتسابی عمل سے گزرو گے اور آخر پر اُسی پیڑ کے پرندے داخلی سکون محسوس کریں گے جو داخلی روحانیت اور خارجی مادیت کی کشمکش کے دوران توازن کی راہوں پر اعتدال کے ساتھ سفر کرتے آئے ہیں۔

ابتدائی ادوار کی تاریخ نے دونوں پیڑوں کی جڑوں کو مضبوط سے مضبوط تر بنا دیا ۔دونوں پیڑ نشو و نما پانے لگے۔ پرندے بھی روحانی سایوں او اخلاقی پھلوں سے فیض

یاب ہو رہے تھے۔ ہر پرندہ اطمینان کے ساتھ پرواز کرتا تھا۔اس لئے یہ ادوار دونوں پیڑوں پر بیٹھے پرندوں کو راحت افزا محسوس ہوئے۔

کچھ مدت کے بعد سبز رنگ کے پرندے نے تاریخ کے ادوار کا ایک اور حصہ پیڑوں کی طرف پھینکا۔ان ادوار کی تاریخ جڑوں پر پڑتے ہی سرخ کپڑے والے پیڑ کے ارد گرد کالے دھویں کے گولے اٹھنے لگے اور آن ہی آن میں اس پیڑ کے پرندوں کو کالے دھویں نے اپنی گود میں سُلا دیا۔اس کے برعکس سبز کپڑے والے پیڑ کے ارد گرد روشنی کے مینار کھڑے نظر آنے لگے۔اس پیڑ کے پرندے تیزی کے ساتھ آزاد فضاؤں میں اڑنے لگے، وہ داخلی سطح پر بھی مطمئن نظر آتے تھے اور خارجی طور پر بھی پر سکون دکھائی دیتے تھے۔ یہ لمبا دور سبز کپڑے والے درخت کے پرندوں کے لئے خوش نصیبی کا ضامن ثابت ہوا۔فارغ البالی کے ان ادوار میں، ان خوشحال پرندوں نے اپنی زمین میں روحانیت کے بیج بوئے اور زمین کے ارد گرد ضرورت کے مطابق مادیت کے پیڑ بھی اگائے۔اس تہذیب کے رواں چشموں سے فیض بخش پانیوں کا ظہور ہوا جو کئی صدیوں تک نہ صرف ان پرندوں کو سیراب کرتا رہا بلکہ اندھیرے پیڑ کے چند پرندے بھی ان چشموں سے اپنی پیاس بجھاتے رہے۔وہ جب اس پیڑ کے خوشحال پرندوں کی داستان اندھیرے کے شکار اپنے ساتھیوں کو سناتے تھے تو وہ حیرت زدہ ہو جاتے تھے۔روحانیت کے پرستار پرندوں کی دریا دلی کا وہ اب ناجائز فائدہ اٹھانے لگے اور ان کے خلاف اندرونی طور پر سازشیں بھی رچانے لگے۔کئی دفعہ دونوں کے درمیان ٹکراؤ بھی ہوئے لیکن روحانیت کے پرستار پرندے ہمیشہ غالب رہے۔

سبز رنگ کے پرندے نے اب تاریخ کے وہ ادوار پیڑوں کی طرف پھینکے جو

روحانیت اور مادیت کے درمیان کشمکش کے ادوار رہے تھے۔ تاریخ کے یہ ادوار سرخ کپڑے والے پیڑ کے پرندوں کے حق میں سودمند ثابت ہوئے اور سبز کپڑے والے پیڑ کے پرندوں کے لئے روحانی طور پر فائدہ منداور مادی طور پر ناکام ثابت ہوئے بالالفاظ دیگر سبز کپڑے والے پیڑ کے اردگرد روشنی کم اور اندھیرا زیادہ دکھائی دینے لگا۔ تاریخ کے یہ دور صاف بتا رہے تھے کہ سبز کپڑے کے درخت پر بیٹھے ہوئے پرندے اب خواب غفلت میں پڑے ہوئے جمودی فکر کا شکار ہو چکے تھے روحانیت کی غلط تعبیر کی وجہ سے ان کے طاقت ور پروں پر سستی اور بے ہمتی کے سائے پڑ گئے تھے۔ دوسری جانب صدیوں تک اندھیرے میں رہنے والے پرندوں کی دنیا روشن ہوتی جارہی تھی۔ وہ بڑی چالاکی اور مستعدی کے ساتھ ان چشموں کو پانے میں لگ گئے جو خوشحال پرندوں کی میراث تھے۔ کئی صدیوں کی جدوجہد کے بعد جب مادیت پرست پرندے سفید و سیاہ کے مالک بن گئے تو روحانیت پسند پرندوں کی آنکھیں کھلنے لگیں لیکن اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔ مادیت پرستی کے جنون میں سرخ کپڑے والے پیڑ کے پرندوں نے زندگی گزارنے کے لئے مصنوعی اصول اورقوانین بناڈالے جوفطری اصولوں اورقوانین سے متصادم ہورہے تھے۔ جس کے نتیجے میں وہ فکری انتشار کی لپیٹ میں آ گئے۔ داخلی بے چینی اور خارجی بے قراری کی وجہ سے ان کی سوچ پر پاگل پن کے اثرات طاری ہونے لگے۔ اپنی قوت کا غیر فطری استعمال کرنے کے باعث انھوں نے اُسوقت اپنے آپ کو وحشی جانور کے طور پر پیش کیا جب ان کے آگ برساتے گولوں سے زمین کا ایک خوبصورت حصہ جل کر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو گیا اور اس خطے کے سینکڑوں پرندے دھکتے شعلوں کی نظر ہو گئے۔ زندگی کے ہر موڑ پر فطری قوانین سے بغاوت کرنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ ان کی نئ

نسل، جنہیں وہ پھول سمجھ بیٹھے تھے، خار بن کران کی روح کو چبھنے لگی اوران کے مصنوعی تصورات کیڑے بن کران کے جسم کواندر سے کورنے لگے۔اب یہ مصنوعی سوچ کی اسیر نسل داخلی سکون کی تلاش میں سرگرداں نظر آرہی تھی۔

سبز رنگ کے پرندے نے تمام ادوار کی تاریخ کو واپس اٹھا کر اپنے اپنے پلڑے میں ڈال دیا۔ مادیت کا پلڑا ہلکا ہوا جارہا تھا اور روحانیت کا پلڑا بھاری پڑ رہا تھا۔ مادی تہذیب کے پیڑ کی جڑیں آہستہ آہستہ ہل رہی تھیں اور وہ اندر ہی اندر کھوکھلا ہوا جارہا تھا۔اس کے برعکس روحانیت کے پیڑ کی جڑیں مضبوطی کے ساتھ اپنی زمین سے پیوستہ تھیں۔اس کی چند ہی جڑیں کمزور پڑ گئی تھیں۔سبز رنگ کے پرندے نے اعلان فرمایا کہ دونون تہذیبیں احتسابی عمل سے گزر چکی ہیں اسلئے انھیں احتسابی جزیرہ چھوڑنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

تمام پرندے اپنے اپنے آشیانوں کی طرف لوٹنے لگے۔روحانیت پرست پرندے اطمینان کے ساتھ محو پرواز تھے لیکن مادیت پسند پرندوں کواپنے بنائے ہوئے کانچ کے گھونسلے ٹوٹتے بکھرتے نظر آرہے تھے۔وہ اپنی شناخت کو بچانے کے لئے حواس باختہ ہورہے تھے۔دوران پرواز وہ روحانیت پرست پرندوں پرگاہے گاہے حملہ بھی کرتے رہتے اور روحانیت پرست پرندے بھی اپنے دفاع کے لئے جوابی حملوں کی تیاریاں کررہے تھے۔سبز رنگ کے پرندے نے اونچی اڑان بھری تھی۔وہ دور سے دیکھ رہا تھا کہ فضائے بسیط میں ہر طرف رَن مہتاب کے شعلے چمک رہے ہیں اور وقت محسوس کررہا تھا کہ تاریخ کا یہ دوران دو تہذیبوں کا آخری احتسابی دور ہے اور روحانیت اور مادیت کے مابین آخری کشمکش......آخری کشمکش......!!!

گمشدہ سرمایہ

وہ تیسری بار سرکاری اسپتال میں ایڈمٹ ہوا تھا۔ میڈیکل رپورٹ پڑھتے ہوئے اُس کی آنکھیں نم ہوئیں۔ رپورٹ فائل کو بند کرتے وہ سوچنے لگا کہ آج وہ زندگی کے اس پر کھٹن موڑ پر تنہا کھڑا ہے جہاں پر اُسے سہارے کی ضرورت ہے۔ اپنوں کے سہارے کی... جن کا کیریئر بنانے کے لئے اُس نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگایا تھا۔ بڑھاپے کے بھیانک خوف اور ہارٹ پرابلم کے خوفناک ڈر نے اُس کے دماغ کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اُس کی سوچ جب دماغ کے دو حصّوں کو جوڑنا چاہتی تو وہاں انتشار کا آتش فشاں پھٹ جاتا اور وہ مایوسی کے عالم میں خود کو پر شکستہ پرندہ تصّور کرتا۔

اس کا کنبہ بارہ نفوس پر مشتمل تھا جس میں اُس کے علاوہ اُس کے چار لڑکے، اُن کی بیویاں اور بچے شامل تھے۔ چاروں لڑکے دوسرے ملکوں میں جاب کرتے تھے۔ ان کو اعلیٰ تعلیم دلانے میں اُس نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ خود تو وہ ایک پینشن یافتہ پوسٹ مین تھا لیکن اپنے بچوں کے کیریئر کو سنوارنے میں اُس نے اپنا تمام سرمایہ لٹا ڈالا تھا۔ وہ خود غرض قسم کا انسان نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ سمجھتا رہا کہ انسان کی زندگی ایک لمبی دوڑ کی طرح ہے جس میں والدین، بھائی بہنوں اور اپنی اولاد کے لئے پڑاؤ آتے

ہیں اور انسان کو دوڑنے کے دوران تمام منزلوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔اس طرح سے زندگی کا یہ لمبا سفر بہتی ندی کی طرح آگے بڑھتا رہتا ہے۔اُس کے والدین جب تک حیات تھے وہ ہمیشہ ان کی نگاہوں میں ایک فرمانبردار بیٹا رہا اور ان سے دعائے خیر پاتا رہا۔لیکن آج وہ خود زندگی کے اُس پڑاؤ پر پہنچا تھا جہاں اُسے اپنے بچوں کے سہارے کی ضرورت محسوس ہورہی تھی۔لیکن......اُس کے بیٹے اپنا اور اپنے بچوں کا مستقبل بنانے میں ایسے کھو گئے کہ ان کے ذہن سے شاید ''ماں باپ'' جیسے عظیم لفظوں کا تصور تک ''گمشدہ شئے'' کی طرح محو ہوئے تھے۔وہ برسوں پہلے بدیش چلے گئے‘ جہاں پر اُس کا ایک لڑکا نامور ہارٹ سرجن تھا اور دوسرے لڑکوں کا بھی اچھا خاصا بزنس تھا۔وہ جب بھی ان کی لاپرواہی کے بارے میں سوچتا تو خود کو کوستا رہتا کہ شاید اُسی کی تربیت میں کچھ کھوٹ رہی ہوگی۔

اسپتال میں اُسے پڑے ہوئے کئی ہفتے گزر گئے ۔روز بروز اس کی بگڑتی صحت کو دیکھتے ہوئے ایک دن ڈاکٹروں نے کہا کہ اُسے ہارٹ سرجری کرنا پڑے گی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ یہ آپریشن امریکہ میں مقیم مشہور ہارٹ سرجن ڈاکٹر ارشد خان ہی کرسکتا ہے‘جس کے لئے اُسے ایک لاکھ روپے بطور فیس ادا کرنا پڑے گا۔ڈاکٹر ارشد کا نام سنتے ہی غفار خان کا چہرہ خوشی سے کِھل اٹھا‘ وہ فخریہ انداز سے خود کو دنیا کا سب سے بڑا خوش نصیب باپ سمجھنے لگا۔اُسے وہ وقت یاد آیا جب ارشد کو امریکہ روانہ کرنے کے لئے اُس نے اپنے جی۔پی۔فنڈ سے پچاس ہزار روپے نکالے تھے اور پیسہ نکالتے وقت جب اپنے آفیسر نے اُسے پوچھا تھا کہ ''غفار خان...اب تم ریٹائر ہورہے ہو‘ بس بہت کم وقت بچا ہے .اپنے لئے کیا رکھو گے؟''تو غفار خان نے اطمینان سے جواب دیا تھا۔

''جناب! میری زندگی کا اصلی سرمایہ میرے بچے ہیں۔ اگر میں اپنے پیسوں سے اپنے بچوں کو خوشیاں نہ دے سکوں تو یہ پیسے میرے کس کام کے......؟''

چند دنوں کے اندر غفار خان نے امریکہ میں مقیم اپنے لخت جگر ڈاکٹر ارشد خان سے فون پر رابطہ کیا اور اپنے آپریشن کے بارے میں بتایا۔ ارشد خان نے اپنی پیشہ وارانہ مصروفیات کا بہانہ بنا کر یہ کہتے ہوئے اپنا دامن چھڑا لیا کہ ''وہ آپریشن کے سلسلے میں ڈاکٹروں کو فون پر ہی ضروری معلومات فراہم کرے گا۔'' اپنے مشہور ڈاکٹر بیٹے کا یہ مشورہ سُن کر غفار خان ٹھنڈا پڑ گیا' وہ لڑکھڑاتے ہوئے اسپتال کے زینے چڑھنے لگا جیسے بے یارومددگار ہمالہ کی چوٹی سر کرنے پر مجبور ہو رہا ہو۔

ایک دن غفار خان کا چیک اپ کرتے ہوئے ڈاکٹروں نے اُسے بتایا کہ ''خوش قسمتی سے ڈاکٹر ارشد ایک آپریشن کے سلسلے میں آج امریکہ سے یہاں آ رہے ہیں کیونکہ کل اُنہیں ایک منسٹر کے لڑکے کا آپریشن کرنا ہے جس کے لئے ڈاکٹر ارشد کے اکاونٹ میں دو لاکھ روپے جمع کر دیئے گئے ہیں۔'' ڈاکٹروں نے غفار خان سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے مزید کہا کہ ''اگر تم پیسوں کا انتظام کر سکو گے تو تمہارا آپریشن بھی کل ہو جائے گا۔''

یہ سنتے ہی غفار خان کا چہرہ زرد پڑ گیا؟ وہ کچھ کہہ نہ سکا وہ سوچ رہا تھا کہ اُس کے پاس دوا خریدنے کے لئے ایک کوڑی بھی نہیں ہے یہاں تو ایک لاکھ کا مسئلہ ہے۔ غفار خان کا دوست رجب علی اسوقت وہاں پر موجود تھا۔ اُس نے غفار خان کی بے چین حالت دیکھ کر کہا کہ ''میرے دوست تم فکر مت کرو۔ تمہارے آپریشن کے لئے میں اپنے سخاوت سنٹر سے پیسوں کا انتظام کرونگا۔ تم ضرور ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' غفار خان کو دلاسہ دے کر رجب علی ڈاکٹر ارشد کا انتظار کرنے لگا۔ چند گھنٹوں کے بعد

جب رجب علی کو ڈاکٹر ارشد کے آنے کی اطلاع ملی تو وہ گسیٹ ہاؤس میں اُسے ملنے کے لئے چلا گیا۔ ڈاکٹر ارشد سے آپریشن کے سلسلے میں ٹائم مقرر کرنے کے بعد رجب علی واپس لوٹ کر غفار خان کے بیڈ پر بیٹھ گیا تو پُر مسرت لہجے میں اُسے کہنے لگا:

"ڈاکٹر ارشد کے ساتھ تمہارے آپریشن کے بارے میں بات ہوئی۔ اُنہوں نے فیس میں سے بھی پچاس ہزار روپے کم کر دئے۔ کل صبح سویرے وہ تمہارا آپریشن کرے گا۔"

یہ کہہ کر رجب علی نے جب غفار خان سے گھر جانے کی رخصت لے لی تو غفار خان کو محسوس ہونے لگا کہ "اُس کا نورِ چشم آپریشن کرنے کے لئے رضامند نہیں ہوا ہے بلکہ پیسوں کی لالچ میں اپنے باپ کے دل کو کُند چھری سے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لئے تیار ہوا ہے۔" یہ سوچتے سوچتے غفار خان کے دل سے ایک ہوک سی اٹھی جو دھیمی دھیمی آواز میں کہہ رہی تھی کہ "آج ایک بیٹے نے اولاد کے فرض اور باپ کے حق کو سرِ عام نیلام کر دیا۔"

غفار خان رات بھر افسوس کرتا رہا کہ اُس نے ایک انسان کو گھر سے باہر بھیجا تھا وہ وہاں جا کر کیسے حیوان بن گیا۔ صبح ہونے سے پہلے غفار خان یہ کہتے کہتے بیڈ پر لیٹ گیا کہ "نافرمان اولاد گمشدہ شے کے مانند ہوتی ہے۔" سویرے جب اسپتال کا عملہ غفار خان کو آپریشن تھیٹر میں لے جانے کے لئے وارڈ میں داخل ہوا تو وہ غفار خان کے ٹھنڈے جسم کو دیکھ کر مایوس ہو کر واپس لوٹا... کیونکہ غفار خان نے زندگی کی اُداس دوڑ سے سحر ہوتے ہی چھٹکارا حاصل کیا تھا اور اُس کی کھلی آنکھیں کسی گمشدہ سرمایہ کے تلاش کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔

سفید ہاتھی

آسیب...... گہری نیند کا آسیب......ان کی سوچ پر چھایا ہوا تھا۔ وہ......ان کی بے خودی دیکھ کر بے چین ہو رہا تھا اور ان بے حس سوچ رکھنے والوں کے بند پڑے دماغوں کے دریچوں کو کھولنے کی کوشش میں لگا رہتا لیکن بار بار کوشش کرنے کے باوجود اُسے کبھی کبھی محسوس ہوتا تھا کہ ان کے دماغ زنگ آلودہ سوچوں کے جمودی کھنڈرات بن چکے ہیں۔ وہ جب اندھیرے دنیا کی چھتوں پر بیداری کی روشن قندیلیں لٹکائے رکھتا اور ان کے گونگے پن کو آواز میں بدلنا چاہتا تو وہ ان کی آنکھوں میں بصیرت کے چراغوں کو ٹمٹماتے ہوئے' ان کی زبانوں کو بھی اندرونی گروہ بندی کے بکھیڑوں میں الجھنے کی وجہ سے ہکلے پن کا شکار پاتا۔ ان کے فرسودہ خیالات پر اُسے ترس آرہا تھا......طوفان کے گھپ اندھیرے میں خیالی ابابیلوں کا انتظار...... خوش فہمی ......صرف خوش فہمی کا دھوکہ' اور خوش فہمی کا نتیجہ......مقدر کا سراب......وہ سوچتا رہتا کہ خوابِ غفلت میں مست یہ مخلوق......سورج سنسار میں ہو رہی دھما کہ خیز تبدیلیوں سے بے پروا......اپنی اپنی پنجر نما بلوں کو گوشۂ عافیت سمجھنے کے فریب میں ڈوبتی چلی جارہی ہیں۔ ان کند ذہنوں کا عالم' ابھرتے ڈوبتے سورج کی گردش تک محدود ہو کے رہ گیا ہے۔ کارگاہ ہستی کے گھمسان رن میں ان کے اپاہج قدموں کی

آہٹ بھانپ کراوران کے کھوکھلے لفظوں کی جھنکار سن کر......اُس کا وجود لرز اٹھتا تھا۔ وہ چلاتا رہتا کہ کھوکھلے لفظوں کی تکرار، بونوں اور بےہمتوں کی نشانی ہوتی ہے۔ان کی بےحسی کو کوستے ہوئے وہ انھیں ایسی جمادات نما مخلوق قرار دیتا جو صرف ادھار سانسوں کا حساب رکھنا جانتی ہو۔ وہ ان کے خوابیدہ ذہنوں میں انقلاب برپا کرنا چاہتا تھا لیکن ان کی سرد مہری دیکھ کر اسے یقین ہو جاتا تھا کہ یہ مخلوق تو رزم گاہِ حیات میں کودنے سے خوف کھا رہی ہے اور صرف توکل کے نام پر حیات مستعار پر ہی قانع کے متمنی ہے۔

سفید ہاتھی آندھی کی طرح ان کے گلستانوں کی طرف بڑھ رہے تھے اور ان کے کھیت کھلیانوں کو تباہ کرتے جا رہے تھے۔ وہ اپنی لمبی لمبی سونڈوں کی بدبودار سانسوں سے ان کے خوشبودار چمن زاروں کو زہرآلود کرتے جا رہے تھے اور اپنے پتھر جیسے بھاری پاؤں سے ان چمن زاروں کے رنگ برنگے پھولوں کو مسل رہے تھے۔

سفید ہاتھیوں کا یہ وحشی قافلہ عرصہ ہائے دراز سے ان پر حملہ آوار ہوا تھا۔ یہ قافلہ اس جمادات نما مخلوق کو صفِ ہستی سے نیست و نابود کرنے پر تلا ہوا تھا۔ وہ، بڑے غور سے سفید ہاتھیوں کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران پڑ جاتا کہ ان حملہ آور ہاتھیوں کے پیچھے قُقنُس کا مسحور کن ساز بج رہا ہے اور اس ساز کی بدلتی رہتی آواز یں ہاتھیوں کی وحشیانہ سوچ پر اثر انداز ہو رہی ہیں......ان کے وحشیانہ جذبات کو بھڑ کا رہی ہیں اور ان کو اپنے مقصد کو پورا کرنے تک متحد رہنے کی صدائیں دے رہی ہیں ۔

ساز کی دلفریب دُھنیں سفید ہاتھیوں کے جوش کو اُبال دینے میں مگن تھیں۔ سونڈوں سے شعلے برس رہے تھے جن کی لپٹوں سے مظلوم مخلوق کی تاریخی پناہ گاہیں،

آگ کی خندقیں بن رہی تھیں اور تباہی مچانے کے بعد وہ بدمست ہاتھی محکوم مخلوق کے کنوؤں سے آب حیات پیتے ہوئے راحت محسوس کر رہے تھے۔

وہ......ان سفید ہاتھیوں کے عزائم' ان کی ہمت اور مادی مقاصد کے رازوں کو جاننے کے لئے بے چین ہو رہا تھا۔ وہ یہ جان کر سخت حیران ہوا کہ نہ صرف ققنس کے راگ سفید ہاتھیوں کی رہنمائی کر رہے ہیں بلکہ پردے کے پیچھے چھپے کالے ناگ بھی پھن مارتے ہوئے انھیں آگے بڑھنے کے لئے اُکسا رہے ہیں۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ کالے ناگ تو اپنی فطرت پر برابر قائم ہیں یہ تو آستین کے سانپ ہی نکلے۔ مکاری اور دغابازی کے جراثیم تو ان کی رگوں میں خون کی طرح گردش کر رہے ہیں......احسان فراموش......!!

اس کی آنکھوں کے سامنے کالے ناگوں کا وہ دور گردش کرنے لگا جب ان کی دھرتی بنجر نما جنگل تھا......وہاں تہذیب وتمدن کا کہیں نام ونشان بھی نہ تھا......اس نیم مردہ مخلوق نے ہی ان کے چمن کو تہذیب وتمدن کا گہوارا بنایا تھا اور ان کی دھرتی ہیرے موتی اُگلنے لگی تھی۔ جن کی چمک دمک سے ان سفید ہاتھیوں کی آنکھیں سرخ ہو کر ان کے گلستان پر قابض ہو گئے تھے۔ اسوقت ان بزدل کالے ناگوں کی ہمت اسی مظلوم مخلوق نے بڑھائی تھی جن کے خلاف آج یہ سفید ہاتھیوں کے ساتھ مل کر درپردہ سازشیں رچا رہے ہیں۔ اگر یہ کالے ناگ اپنی دھرتی سے آج بھی پوچھیں گے کہ تجھے آزادی کیسے نصیب ہوئی تو اُس دھرتی کی سچی تاریخ اس محکوم مخلوق کے کارناموں کو ضرور دہورائے گی......بنجر زمین کے یہ کالے ناگ سب احسان بھول بیٹھے ......!!!

اس اندوہناک صورت حال کا مشاہدہ کر کے وہ دوبارہ بے حس مخلوق کو بیدار

کرنے لگاان کوتمام حقیقتوں سے باخبر کرنے لگا۔ وہ انھیں ....ان کے دورِاقتدار کی داستانیں سناتا رہااورانھیں چلا چلا کر پکارتا رہا کہ اٹھو! ان وحشی درندوں کو ماضی کی طرح سبق سکھاؤ۔اپنی بہادری اور جواں مردی کے جوہر دکھاؤ......تمہارے چمن کے چند بہادر شاہین پہلے ہی ان وحشیوں پر جھپٹ پڑے ہیں...... ہوش میں آجاؤ..تم کمزور نہیں ہو......تم میں صرف اتحاد کا فقدان ہے۔متحد ہوکر ان بزدلوں پر ٹوٹ پڑو......اندھیرا مٹنے والا ہےاوراُجالاتمہاراانتظار کررہا ہے......اٹھو!اپنے گلستانوں کو بچاؤ......اپنے نخلستان کو بچاؤ...... یہ کہتے ہوئے وہ آسمان کی طرف آبدیدہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔اُس کے اندر سے سرد آہیں نکل رہی تھیں۔اُسے محسوس ہونے لگا کہ اُس کی سرد آہوں سے افلاک کے پردے چاک ہورہے ہیں۔بارانِ رحمت کا نزول ہورہا ہےاورچمن کے پھولوں کا نکھار بڑھ رہا ہے۔اُسے نظر آنے لگا کہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں سے نیم مردہ مخلوق کی بند پڑی آنکھیں آہستہ آہستہ کھل رہی ہیں اور بھینی بھینی خوشبوؤں سے ان کے دماغوں نے سوچنا شروع کردیا اوران کے جسم سفید ہاتھیوں کے شعلوں کی تپش محسوس کرتے ہوئے حرکت کرنے لگے۔

دھوپ نکلنے کے ساتھ ہی......وہ......دوردورتک چیونٹیوں کی لمبی لمبی قطاروں کو پھلتا ہوا دیکھ رہا تھا۔سفید ہاتھیوں کی بدصورت سونڈیں کنوؤں سے آبِ حیات چُرانے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔چیونٹیوں نے مخصوص حکمت عملی کے تحت آہستہ آہستہ ان سونڈوں میں گھسنا شروع کردیااوران کے دماغوں کونوچ کران کے جسموں کواندر ہی اندر کھوکھلا کرنے لگے۔سفید ہاتھی اندرونی زلزلے سے تھرتھرا کر دھڑادھڑ زمین پر گرنے لگےاورسازشی قَقنس کا گلہ شاہینوں کے ڈر سے بیٹھنے لگااوروہ کرگسوں کی طرح چمن سے بھاگنے لگے۔کالے ناگ اپنے حلیفوں کی یہ شکست خوردہ اوروحشت ناک

صورتحال دیکھ کر بزدلوں کی طرح مکاری کے بلوں میں چُھپ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے نیم مردہ مخلوق نے ایک طاقت ور قافلے کی صورت اختیار کر لی۔ چمن دوبارہ خوشبودار ہواؤں سے مہک رہا تھا اور......وہ......خوشی سے جھوم رہا تھا کہ اس کی صدائیں محکوم مخلوق کو جگانے میں 'بانگ درا' ثابت ہوئیں......وہ......انھیں شاباشی دیتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ وہ مردہ بن گیا تھا لیکن اب وہ زندہ ہے......زندہ......!

..................☆☆☆..................

نا کہ بندی

چار مہینے کا ننھا سا پھول دودھ کی ایک ایک بوند کے لئے ترس رہا تھا۔ اُس کی دلخراش چیخوں سے ماں باپ کے جگر پارہ پارہ ہورہے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے ان کے کلیجے کو تیز تلوار سے کاٹا جارہا ہو۔ بھوکے بچے کی ابتر حالت اور اپنی بے بسی و بے کسی کا رونا روتے روتے ساجدہ اور بشیر ملک کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ بنجر زمین کے بنجر ذہن آدھی باسیوں نے سرسبز اور شاداب وادی کے بے مثل مہمان نواز انسانوں کا دانہ پانی بند کر رکھا تھا۔ کئی مہینوں سے چل رہی اقتصادی نا کہ بندی کے ٹوٹنے کے تمام راستے' بلوایوں کے محسن جمہوریت پسند سیاستدانوں کی شاطرانہ مصلحت آمیزی اور جانبدارانہ پالیسوں کے بھنور میں پھنسے ہوئے تھے اور وادی کے طول وعرض میں قحط نما صورت حال تھی۔

''بشیر! منا بے ہوش ہوگیا ہے'' ساجدہ نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ ''کہیں سے آٹو کا انتظام کرو اس کو اسپتال لے جائینگے۔''

''اس اندھیری وحشت ناک رات میں ہم کس طرح گھر سے نکلیں گے۔'' بشیر ملک نے آنکھیں موندتے ہوئے کہا'' باہر کرفیو لگا ہوا ہے۔ صبح تک انتظار کرنا پڑے گا۔ پھر......صبح کو بھی کون اسپتال جانے دیگا۔''

لیکن بشیر......صبح......؟ ساجدہ کچھ اور نہ کہہ سکی۔

''ساجدہ! کسی پڑوسی سے منا کے لئے دودھ ادھار مانگ لو' بشیر ملک نے کہا۔

ساجدہ غم ناک آواز میں بولی'' وہ لوگ مجھ سے ہی دودھ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ان کے بچے بھی بھوک سے بلک رہے ہیں۔''

کچھ دیر کے بعد فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ بشیر ملک نے ریسور اٹھایا۔ جموں سے اُس کا چھوٹا بھائی عرفان ایک ہی سانس میں بول پڑا'' بھائی جان ! اندھیرے کا سہارا لے کر میں ٹرک لے کر جموں سے گزر رہا ہوں۔فکر مت کرنا! میں نے منے کے لئے دودھ کی ایک پیٹی بھی لائی ہے۔''بشیر ملک نے یہ بات جب ساجدہ کو بتائی تو اس کا چہرہ َکھل اٹھا۔

بشیر ملک نے کرسی پر بیٹھ کر تھوڑی سی راحت محسوس کی۔ وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا اور گزرے دنوں کی خوشنما یادوں میں کھو گیا۔ اسے یاد آیا کہ کس طرح ہم کشمیری اپنی جنت میں وارد مہمانوں کا استقبال بے مثل فراخ دلی سے کرتے تھے اور اپنی مہمان نوازی کے حسین نقوش ان کے دلوں پر چھوڑ کر بار بار یہ ثابت کرتے آئے ہیں کہ'' ذرا ذرا ہے میرے کشمیر کا مہمان نواز۔'' اُس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں لیکن وہ اب کچھ اور ہی محسوس کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس انسانی سلوک کے بدلے یہ لوگ حیوانیت پر اتر آئے ہیں' ان لوگوں نے اپنے زہر آلودہ منصوبوں سے وادی کے خوش نما اور خوبصورت پھولوں کو مسلنے کی قسم کھائی ہیں۔ان کی خمیر میں ہی شاید منافرت کا زہر ملا ہوا ہے' نہیں تو یہ لوگ کیسے بھول جاتے کہ جب یہ لوگ کشمیر میں اپنے مذہبی مقامات پر زیارت کے لئے آتے تھے تو ہم لوگ جگہ جگہ ان کے لئے کھانے پینے کا اعلیٰ انتظام رکھتے تھے اور ماضی میں کئی بار جب موسم کی خرابی کی وجہ سے یہ لوگ

مصیبت میں پھنس گئے تھے تو ہمارے گھر ان کے لئے بہترین اور پرامن پناہ گاہیں ثابت ہوئے اور آج یہی لوگ زمین کے وارثوں کو ہی کاشت کار بنانا چاہتے ہیں اور مکان کے مکینوں کو کرایہ دار......!

یہ لوگ پریشانیوں کی وجہ سے کئی راتوں سے سو نہیں پائے تھے۔ رات کے آخری حصے میں جب بشیر ملک کی آنکھ لگ گئی تو صبح سویرے انھیں فون پر کسی دوست نے اطلاع دی کہ آج کسی رضا کار تنظیم کی طرف سے انسانی حقوق کے دفتر کے سامنے ملک فوڈ بانٹا جائے گا۔ بشیر ملک یہ سُن کر گھر سے تیزی کے ساتھ نکلا اور شہر کے تنگ گلی کوچوں سے گزرتے ہوئے وہاں پہنچ گیا اور بڑی مشکل سے دودھ کا ایک ڈبہ حاصل کر پایا۔ ادھر ساجدہ اپنے بے ہوش لخت جگر کو لے کر اسپتال کی جانب دوڑ پڑی۔ وہ جب پریشان حالت میں سنسان سڑک کو پار کر رہی تھی کہ اچانک کہیں سے آواز آئی ''کرفیو میں کہاں جا رہی ہو:؟''

ساجدہ نے خوف کے مارے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں آنسو بہاتے ہوئے بولی۔

''بچہ بیمار ...... اسپتال......!'' یہ سنتے ہی کئی وردی پوش سڑک پر نمودار ہو گئے۔ ساجدہ دہشت زدہ ہوئی' اُس نے بچے کو چھاتی سے لگایا۔

''اچھا! بیمار بچے کو اسپتال لے جانا ہے'' ایک وردی پوش بولا ''اسپتال جا کر کیا کرو گی وہاں تو دوائی نہیں ہیں۔''

چند لمحوں بعد کہیں سے ایک سنسناتی ہوئی گولی آئی اور بچے کے پھول جیسے نازک بدن کو چیرتی ہوئی ماں کے دل میں پیوست ہو گئی۔ چاروں طرف ہنسنے کی آوازیں آئیں اور خون میں لت پت دونوں لاشیں گھر کے صحن میں پھینک دی گئیں۔

بشیر ملک شہر کی گنجان آبادی سے چوری چھپے خوش ہو کر دودھ کا ڈبہ بغل میں چھپاتے ہوئے جب گھر کے مین گیٹ پر پہنچا۔تو صحن میں داخل ہوتے ہی اُس کی نظر بیوی اور بچے کی لاش پر پڑی۔وہ حواس باختہ ہو کر چیخنے چلانے لگا۔اس کی چیخیں صدابہ صحرا ثابت ہو رہی تھیں کیونکہ وردی پوشوں کے خوف نے تمام لوگوں گھروں کے اندر چُھپنے پر مجبور کر دیا تھا۔

عرفان جب رات کے اندھیرے میں چاول سے بھرا ٹرک کشمیر کی طرف لے کر آ رہا تھا تو بیچ سڑک پر اُسے بُلوائیوں نے روکا۔ترشول کی چمک اور خوفناک آوازیں ظاہر ہوئیں:

''ہر ہر مہادیو۔وندے ماترم......بلوائیوں نے ٹرک پر حملہ کر کرے سارا چاول لوٹ لیا اور عرفان کو ٹرک کے ساتھ زندہ جلا ڈالا۔بشیر ملک اس اندوہ ناک صورت حال سے بے خبر تھا۔اُس نے عرفان پر موبائل پر رابطہ کرنے کی کوشش کی تا کہ وہ اسے گھر کے سانحہ کے بارے میں بتائے لیکن عرفان کا موبائل بند آ رہا تھا۔ایک گھنٹے کے بعد عرفان کے ایک ساتھی ڈرائیور کا فون آیا۔اُس نے بشیر ملک کو عرفان کے حادثے کے بارے میں بتایا۔یہ خبر سنتے ہی بشیر ملک کے اوپر جیسے دوہرا آسمان ٹوٹ پڑا۔اُس کی آواز بند ہوگئی۔

کرفیو میں آدھے گھنٹے کی ڈھیل دی گئی۔بشیر ملک گھر سے باہر نکلا اور بازار کی طرف چل پڑا۔اُس کے ہاتھ میں دودھ کا ڈبہ تھا۔کچھ لوگ سڑک پر جمع ہو گئے۔بشیر ملک کے ہاتھ میں مِلک فوڈ دیکھ کر ایک آدمی سامنے آیا اور بشیر ملک سے پوچھنے لگا۔

''اے بھائی!تمہیں یہ دودھ کا ڈبہ کہاں سے ملا؟ کیا اسے بیچو گے؟''

بشیر ملک نے جب ہاں میں جواب دیا تو وہ آدمی حیران ہو کر بول پڑا۔

''لیکن کیوں! تمہیں بھی تو اپنے بچے کے لئے اس کی ضرورت ہوگی۔''

''میرے بچے کو اب اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ وہ کفن کے انتظار میں ہے۔ جس کے لئے مجھے پیسہ چاہیئے۔'' یہ کہتے ہوئے بشیر ملک کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار اُمنڈ پڑی۔

اسی دوران لوگوں نے ناکہ بندی اور کرفیو کے خلاف پر امن احتجاج شروع کیا۔ مظاہرین کو خاموش کرانے کے لئے وردی پوشوں نے ان پر گولیوں کی برسات برسائی۔ آدھے گھنٹے کی ڈھیل ختم ہوتے ہی دوسرے چند لوگوں کے ساتھ بشیر ملک کی لاش بھی گولیوں سے چھلنی سڑک پر کفن کا انتظار کر رہی تھی۔ اور قانون کی نظروں میں دھول جھونکنے کے لئے دودھ کے ڈبے کو بم بنا کر پیش کیا گیا......!

............☆☆☆..................

جشن قبرستان

بھیانک اندھیرے کے خوفناک سائے جب بستی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے تو انسان تو انسان......بستی کے حیوان بھی خوف کے مارے سہم کر رہ جاتے۔رات کے اندھیرے میں اٹھنے والی دہشت کی خوفناک آوازیں جب لوگوں کے دلوں پر اثر انداز ہو جاتیں تو پیر و جواں کی سوچوں پر وحشت کا سایہ چھا جاتا اور سوچ سمجھ کی قوت مفقود ہو جاتی۔خوف و ہراس کا یہ لمبا سلسلہ بستی کی حقیقی تاریخ کا حصہ بن چکا تھا۔اندھیرے کا یہ خوف جب رات کے وقت بستی کے مکینوں کی دھڑکنوں پر چھا جاتا تو وہ لوگ اندھیرے کمروں میں اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو دھیمی آواز میں قصہ کہانیاں سنانا شروع کر دیتے تاکہ وہ اور ان کے بچے زندگی کے پریشان اوقات میں کچھ دیر کے لئے سکون کے لمحات بھر سکیں۔رات کا کھانا کھانے کے بعد جب دادا جی نے حقہ بھر دیا تو گھر کے تمام بچے اُس کے سامنے کہانی سننے کے لئے بیٹھ گئے۔کچھ دیر تک جب دادا جی نے ان کی طرف غور نہیں کیا تو پانچ چھ سال کا مہذب اُس کے شانے پر سوار ہو کر بول پڑا'' دادا جی! کہانی سناؤ نا......!'' دادا جی نے اُسے اپنے شانے سے اتار کر سامنے بیٹھا دیا۔دادا جی نے زور سے حقے کا ایک کش لیا اور بے تاب بچوں سے پوچھنے لگا'' کہ کونسی کہانی سننا پسند کرو گے؟''

''ہمیں جنوں اور پریوں کی کہانی نہیں سُننا ہے۔'' دس برس کے قیصر نے کہا'' ہمیں اس بھیانک اندھیرے میں دل دہلا دینے والی آوازوں کے بارے میں جاننا ہیں۔''

قیصر کی انوکھی بات سُن کر دادا جی کے ذہن میں جیسے ایک خوفناک دھماکہ ہوا۔ اُسے محسوس ہوا کہ اس کے سوچ کی کشتی کو قیصر نے طوفان کے ایسے بھنور میں پھینک دیا جہاں وہ یہ فیصلہ کرنے سے قاصر نظر آتا ہے کہ اب اس کشتی کو خوفناک کہانی کے پتوار سے آگے کی طرف بڑھائے یا نہیں۔ دادا جی کے سوچ کی کشتی ابھی اسی بھنور میں ہچکو لے کھا رہی تھی کہ شاہدہ نے دادا جی کی کشتی کو یہ کہتے ہوئے پتوار عطا کی کہ'' ہاں دادا جی! ہمیں اندھیرے کی کہانی سناؤ نا؟'' اب دادا جی کی ہمت بندھ گئی اور اُس نے ارادہ کرلیا کہ وہ آج انھیں اس بھیانک اندھیرے کی کہانی ضرور سنائے گا کیونکہ زندگی کا کیا بھروسہ' کب اپنا سفر ختم کرے۔ یہ سوچتے ہوئے دادا جی نے کہانی شروع کی۔

وہ ایک پُرسکون وادی تھی۔ اُس کے چمنستان رنگ برنگے پھولوں سے مہکتے رہتے تھے۔ ان پھولوں کی خوشبودار ہوائیں جب فضا میں پھیل جاتیں تو پہاڑوں کی دوسری جانب بسنے والے لوگوں کے دماغوں کو معطر کر دیتیں۔ اس وادی کی ایک شاندار تاریخ تھی۔ اس کی اپنی ایک تہذیب' اپنا ایک تمدن تھا اور سب سے بڑھ کر جو دولت ان کے پاس تھی وہ تھا ان کا اپنا ایک آزاد ماحول۔ یہ ماحول... بھائی چارے' انسان دوستی اور انسانیت کی روشنی سے چمکتا رہتا تھا۔

''پھر کیا ہوا دادا جی'' شاہدہ نے بیچ میں کہا۔

''تم آرام سے سُنو۔'' داد جی نے کھانستے ہوئے کہا۔

''انسان جب لالچی بن جاتا ہے تو اُس کے اندر انسانیت کا خاتمہ ہو جاتا

ہے۔''اس خوشحالی کو لوٹنے کے ارادے سے لالچی انسانوں نے اس پر کبھی لشکر کشی کر کے اور کبھی مکاری اور چالبازی کا جال بچھانا شروع کر دیا۔وادی کے لوگ کئی مرتبہ ان جابر اور لالچی انسانوں کو شکست دینے میں کامیاب تو ہو گئے لیکن ان جابروں کی طاقت کے سامنے یہ کمزور انسان آخر کار ہار بیٹھے اور اس طرح وادی کے روشن دور پر بھیانک اندھیروں کے کالے سائے چھا جانے لگے۔دادا جی نے یہ کہتے ہوئے یاسر کو حقے میں تمبا کو ڈالنے کے لئے کہا۔یاسر نے تمبا کو ڈال کر اُسے سُلگاتے ہوئے کہا۔

''دادا جی! کہانی ختم ہو گئی؟''نہیں بیٹے'' دادا جی نے کش لیتے ہوئے کہا''یہ کہانی کی ابتداء ہے'' دادا جی نے جونہی دوسرا کش لیا تو باہر اندھیرے کی خوفناک آوازوں سے کان کے پردے پھٹنے لگے۔تمام لوگوں سے کہا جا رہا تھا کہ وہ کل چھبیس جنوری کی صبح وادی کے قبرستان میں جمع ہو کر بادشاہ وقت کے ساتھ جشن قبرستان منائے گے۔تمام بچے یہ خوفناک آواز سُن کر سہم گئے اور دادا جی نے تمام بچوں کو یہ کہہ کر سونے کے لئے کہا کہ کل کہانی کا باقی حصہ قبرستان میں خود دیکھو گے۔

صبح سویرے،تمام لوگ قبرستان میں جمع ہوئے،دادا جی بھی بچوں سمت وقت پر پہنچ گئے۔تمام لوگوں کے زرد چہروں پر خوف و ہراس کی ہوائیں اڑ رہی تھیں۔لوگوں کو سفید کپڑے پہننے کا حکم دیا گیا اور ہاتھوں میں خون سے بھرے گلاس تھما دئے گئے۔بادشاہِ وقت آنکھوں پر دھوکے کی کالی عینک لگا کر ظلم کا جھنڈا لہرانے لگا۔وہ جب لالچ کی کرسی پر بیٹھ گیا تو شاہی فرمان جاری ہوا کہ لوگ اپنی اپنی سنائیں۔

یہ اعلان سنتے ہی ایک بوڑھے شخص نے قبرستان سے اپنے نوجوان بیٹے کی خون آلودہ لاش نکالی اور اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھا کر بادشاہ کے سامنے لائی۔جونہی

اس بوڑھے کے دل سے انصاف کی ایک سرد آہ نکلی تب ہی اُس پر شاہی کوڑوں کی بارش کی گئی۔ اُسے مجبور کیا گیا کہ وہ شاہی قانون پر عمل کرتے ہوئے اُس شاہی دربان کے گلے میں پھول کی مالا ڈالے۔ جس نے مشعل روشن کرنے کے جرم میں اُس کے نوجوان بیٹے کو مار ڈالا تھا۔ اُس مظلوم نے ایک ہاتھ سے اپنے بیٹے کی لاش کو تھامے رکھا اور کپکپاتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اپنے بیٹے کے قاتل کے گلے میں مالا ڈال دی۔ ہر طرف ساز کی دھنیں بجنے لگیں اور بادشاہِ وقت نے دربان کو شاہی ایوارڈ سے نوازا۔

چند منٹوں کے بعد اُدھیڑ عمر کی ایک خاتون کو حاضر ہونے کا حکم ملا۔ سسکیاں لیتے ہوئے وہ خاتون جب اسٹیج پر چڑھ گئی تو اُس نے سر سے سرخ رنگ کفن کا ایک گھٹا اتار کر بادشاہِ وقت کے سامنے رکھ دیا۔ بادشاہ نے اپنے منھ پر رومال رکھتے ہوئے اشارے سے اس خون آلودہ کفن کو ہٹانے کا حکم دے دیا۔ کفن ہٹاتے ہی اُس بے کس خاتون کے ہاتھ میں مٹھائی کا ایک ٹوکرا تھمایا گیا اور وہ آنسو بہاتے بہاتے ان درندوں پر مٹھائیاں ڈالنے پر مجبور کی گئی جنھوں نے اُس کی بیٹیوں کی پاک دامنی کو داغ دار کر کے انھیں موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

آخر پر بادشاہِ وقت کے سامنے ان معصوم بچوں کو ٹولیوں کی صورت میں لایا گیا جن کے والدین اندھیرے کو مٹانے کی کوشش میں مشعل روشن کرتے کرتے مارے گئے تھے۔ یہ یتیم بچے جب ناچتے ناچتے تھک کر گر جاتے تو ان کو یتیم بنانے والے قاتل اسٹیج پر تالیاں بجا بجا کر انھیں اور بھی ناچنے پر مجبور کر دیتے تھے۔

جشن قبرستان کے ختم ہوتے ہی ہر طرف اندھیرا پھیلنا شروع ہوا اور خوفناک آوازوں کے ڈر سے لوگ اپنے اپنے گھروں کی طرف بھاگنے لگے۔ دادا جی جب

بچوں کے ساتھ واپس گھر میں داخل ہو گیا تو قیصر' دادا جی کو پانی پلاتے ہوئے پوچھ بیٹھا
''دادا جی! اس ظالم اندھیرے سے نکلنے کا کوئی راستہ بھی ہے کہ نہیں؟'' دادا جی نے فرش پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا:

''ہاں میری آنکھ کے تارو......اندھیرے کو بھگانے کا ایک ہی راستہ ہے کہ بستی کے گھر گھر سے روشنی کی مشعلیں جل اٹھیں۔ ہر انسان بیدار ہو جائے اور اپنے اندر پوشیدہ خودداری کے جذبے کو ابھارے'' یہ کہتے ہوئے دادا جی نے روشن مشعل ہاتھ میں اٹھائی اور گرج دار آواز میں کہا:

''اور جب......کوئی انسان......انقلاب کی روشن مشعل ہاتھ میں اٹھا کر منزل کی طرف قدم بڑھاتا ہے تو اندھیرا......شکست کھا کر بھاگ جاتا ہے۔''

دادا جی کی اس انقلاب انگیز تقریر نے بچوں کے دل سے بھیانک اندھیرے کا خوف نکال دیا اور وہ کھڑے ہو کر روشن مشعل کو دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے یک زبان ہو کر بول پڑے۔

''دادا جی......ہم سب روشن مشعل اٹھا کر بھیانک اندھیرے کو اپنی بستی سے بھگا دینے کی قسم کھاتے ہیں۔''

..................☆☆☆..................

ببول کے کانٹے

پرنسپل کے ٹیبل پر کالج کی تمام ضروری فائلیں تہہ در تہہ پڑی ہوئی تھیں اور پرنسپل ایک ایک کر کے فائلوں کو چیک کر رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور چہرے پر مایوسی کے آثار نمایاں تھے۔ تمام فائلیں صحیح ہونے کے باوجود نہ جانے کیوں پرنسپل کچھ زیادہ ہی ڈپرس دکھائی دے رہا تھا' حالانکہ چند دنوں پہلے ہی بہترین کار کردگی کے اعتراف میں U.G.C کی ٹیم کی طرف سے اس کالج کو "Grad-A" کے زمرے میں لایا گیا تھا اور خود پرنسپل کو اس کی ایمانداری اور اپنے پیشے میں اچھی کار کردگی کے عوض کئی ایوارڈ ز سے نوازا گیا تھا۔ اُس کے بہت سارے شاگرد اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے اور انھیں پرنسپل کے شاگرد ہونے پر فخر تھا۔ لیکن آج اُسے سب کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ جس کالج میں وہ شان سے قدم رکھتا تھا آج کالج کے احاطے میں قدم رکھتے ہوئے اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ کسی بڑے قید خانے میں داخل ہو رہا ہے' اُس کا آفس جیل کا پنجرہ بن گیا ہے اور وہ خود کوئی بڑا مجرم ہے جس کو آج سزا ملنے والی ہے۔ اُس کا ذہن اُستاد کے مقدس پیشے کے بارے میں سوچنے لگا کہ سماج میں استاد کا رتبہ سب سے برتر مانا جاتا ہے اور قوم کو بنانے میں ایک استاد کلیدی رول ادا کرتا ہے اور اُس کی تعلیم و تربیت ہی سے ایک آدمی' انسان بن جاتا

ہے۔ پرنسپل کا ذہن ابھی اسی ادھیڑ بن میں الجھا ہوا تھا کہ چپراسی نے آفس میں داخل ہو کر منسٹر کے آمد کی اطلاع دی۔ یہ سنتے ہی اُس کے چہرے کا رنگ تبدیل ہونے لگا۔

آج وزیر تعلیم کو کالج کا دورہ کرنا تھا۔ وزیر تعلیم نے چند مہینے پہلے ہی اپنی وزارت کا قلمدان سنبھالا تھا اور یہ اُس کا پہلا دورہ تھا۔ یہ منسٹر چند سال پہلے اس کالج میں زیر تعلیم تھا۔ وہ ایک بڑے سیاسی لیڈر کا لڑکا تھا اور کالج میں ہمیشہ غنڈہ گردی کرتا رہتا تھا۔ کئی بار کالج کے اسٹاف اور اسٹوڈنٹس نے پرنسپل کے سامنے اُس کی غیر شائستہ حرکتوں کی شکایت کی اور پرنسپل بھی اُس کو سُدھرنے کی نصیحتیں کرتا رہا لیکن وہ اپنی بُری عادت سے باز نہیں رہا۔ آخر کار ایک دن اُسے کالج سے نکالا گیا وجہ یہ تھی کہ امتحان کے دوران جب اُسے نقل کرنے سے روکا گیا تو وہ غنڈہ گردی کرنے پر اتر آیا اور پرنسپل کے گریبان پر ہاتھ بھی ڈالا۔ یہ غنڈہ گردی کی انتہا تھی۔ اُسے پولیس کے حوالے کیا گیا اور ساتھ ہی بیڈ کریکٹر کی سرٹیفکیٹ بھی اُس کے ہاتھ میں تھما دی گی۔

وقت گزرتا گیا۔ الیکشن کا وقت قریب آ رہا تھا۔ ایک سیاسی پارٹی کی طرف سے اُسے منڈیٹ ملا اور الیکشن جیتنے کے بعد اُسے وزیر تعلیم بنایا گیا۔

منسٹر بڑے کر وفر کے ساتھ پرنسپل کے آفس میں داخل ہوا۔ اُس کے ساتھ دوسرے کئی بڑے افسران بھی تھے۔ کرسی پر بیٹھتے ہی اس نے کالج کا ریکارڈ طلب کیا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک افسران نے ان فائلوں کا بغور جائزہ لیا۔ تمام افسران نے ریکارڈ صحیح ہونے کی تصدیق کی اور اپنی رپورٹ منسٹر کے سیکرٹری کے حوالے کر دی۔ سیکرٹری نے یہ رپورٹ منسٹر کو تفصیلاً بتا دی۔ رپورٹ سننے کے بعد منسٹر نے پرنسپل سے تیز لہجے میں پوچھا:

''ہمارے پاس شکایت آئی ہے کہ اس کالج میں نقل کی وبا پھیل چکی ہے۔ امتحان کے دوران ہر ایک لڑکے سے پیسہ لیا جاتا ہے اور پھر انھیں نقل کرنے کی چھوٹ دی جاتی ہے، جس کی وجہ سے اس کالج کا رزلٹ دوسرے کالجوں کے مقابلے میں ہمیشہ اچھا نکلتا ہے، آپ لوگ سرکاری کرسی کا غلط استعمال کرتے ہو۔''

''یہ سراسر غلط الزام ہے، اس کالج کا جو بھی طالب علم اچھے نمبرات لے کر پاس ہو جاتا ہے وہ اساتذہ کی محنت اور اس طالب علم کی قابلیت کا نتیجہ ہوتا ہے نہ کہ نقل کرنے کی چھوٹ۔ ویسے تو آپ خود اس بارے میں اچھی طرح سے جانتے ہیں۔'' پرنسپل نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ وضاحت کر دی۔

یہ سنتے ہی منسٹر کا چہرہ غصے سے لال پیلا ہو گیا اور پرنسپل کو معطل کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ ایک پریس رپورٹر نے جب اس معاملے پر پرنسپل سے کچھ کہنے کو کہا تو پرنسپل نے اپنے آفس سے نکلتے ہوئے کہا۔

''سیاست ایک ببول پیڑ کی طرح ہے، جس کے نوکیلے کانٹوں کو عوام جانے انجانے میں اپنے ووٹوں سے تاج کی صورت عطا کرتے ہیں اور کاغذی پیرہن پہنے ہوئے لوگ صرف زخمی ہو جاتے ہیں۔''

..................☆☆☆..................

ٹوٹتی جوانیاں

پبلک سروس کمیشن کی طرف سے سلیکشن لسٹ' جو ایک مقامی نیوز پیپر میں مشتہر ہوا تھا' میں اپنا نام دیکھ کر میں بے حد خوش ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد میری پوسٹنگ شہر سے باہر وادی کے ایک دور افتادہ علاقے گلشن آباد کی گئی۔ ویسے تو میری خواہش شہر میں تھی لیکن میں پھر بھی مایوس نہیں ہوا۔ میں نے سوچا کہ ایک نسبت سے اچھا ہی ہوا۔ اس طرح اپنی اس گلپوش وادی کے پورے حُسن سے محظوظ بھی ہونگے اور دور افتادہ علاقوں میں بسنے والے لوگوں کے رہن سہن اور زندگی گزارنے کے طور طریقوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع بھی ملے گا۔ دیہاتی لوگوں کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔ دیہات میں ایک دہائی گزارنے کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ اگر سادگی' ہمدردی' بھائی چارہ' خلوص اور شرم و حیا کو فطری صورت میں دیکھنا ہو اور ان انسانی خصائل کا حقیقی مشاہدہ کرنا ہو تو دیہات میں جانا چاہیے۔ ویسے تو شہر میں بھی یہ چیزیں ناپید نہیں ہیں لیکن گاؤں کے مقابلے میں شہر کی فضا ہی ایسی ہے کہ یہاں مصنوعیت اور مسابقت کا کچھ زیادہ ہی دور دورہ ہے۔

میری پوسٹنگ گلشن آباد کے پوشہ پورہ گاؤں کے سرکاری اسپتال میں ہوئی۔ رات کے آٹھ بجے میں اسپتال پہنچا۔ میں چوکیدار سے چابی لے کر سیدھے کوارٹر میں

داخل ہوا۔اپنا لوگیج وغیرہ کمرے میں رکھ کر پہلے میں نہایا' کچھ دیر کے بعد چوکیدار نے کھانا وغیرہ تیار کیا اور کھانا کھانے کے بعد سو گیا۔صبح سویرے جاگنے کے بعد میں نے کمروں کی صفائی کروائی۔قریباً دس بجے لوگوں کا ایک ہجوم اسپتال کے صحن میں نمودار ہوا۔چوکیدار میرے کمرے میں حاضر ہو کر بولا" صاحب! گاؤں کے لوگ آپ سے ملنے آئے ہیں۔" میں نے چوکیدار سے کہہ کر انہیں اسپتال کی پارک میں ٹھہرایا۔میں کپڑے تبدیل کر کے میڈیسن کا بیگ ہاتھ میں اٹھا کر پارک میں آ گیا۔پارک میں داخل ہوتے ہی گاؤں کی عورتوں نے گلابی پھولوں سے میرا استقبال کیا۔تمام لوگوں کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔سب سے پہلے میرے سامنے دودھ پیش کیا گیا۔اس کے بعد ایک بڑا ٹوکرا سامنے رکھا گیا۔جس میں مختلف قسم کے پھل' سبزیاں' انڈے وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔مجھے اجنبیت کا قطعی احساس نہیں ہوا۔میں نے اپنا تعارف کرنے کے بعد تمام گاؤں والوں کا شکریہ ادا کیا۔گاؤں کے ایک بزرگ ماسٹر نے اپنا تعارف کرنے کے بعد تمام لوگوں کا تعارف کرایا۔

دن گزرتے رہے۔میں دن بھر اخبارات اور رسائل پڑھنے میں مشغول رہتا تھا۔کبھی کبھار ہی کوئی مریض اسپتال میں آتا تھا۔گاؤں کے لوگ کافی محنتی ہوتے ہیں۔وہ دن بھر کھیتوں میں کام کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کا جسم چُست رہتا ہے۔ان کی خوراک تازہ سبزیاں' چاول اور پھل ہوتے ہیں' اسی وجہ سے گاؤں میں رہنے والے لوگ کم ہی بیمار پڑتے ہیں۔ایک صبح جب میں ابھی بستر پر ہی لیٹا ہوا تھا کہ باہر سے ہر طرف چیخ وپکار کی آوازیں آرہی تھیں۔میں جلدی بستر سے اٹھا اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔اسپتال کے احاطے میں گاؤں کے بیشتر لوگ جمع تھے۔میں نے بہت ساری لڑکیوں کو رسیوں سے باندھا پایا۔لڑکیاں پاگلوں کی طرح اپنے کپڑے

پھاڑنے کی کوشش کررہی تھیں اور عجیب وغریب آواز میں ''دیکھو ہمارا یہ گلستان جس کی ہم ہیں کلیاں'' گارہی تھیں۔ میں یہ وحشت ناک منظر دیکھ کر بدحواس سا ہو گیا اور دوڑتے ہوئے ان لوگوں کے پاس پہنچا ''یہ سب کیا ہیں'' میں نے طیش میں آکر ایک نوجوان کو تھپڑ مارتے ہوئے پوچھا۔ اسکول ماسٹر جلدی سے سامنے کھڑا ہوا اور تیز لہجے میں بولا۔

''ڈاکٹر صاحب! پہلے آپ ان سب لڑکیوں کو بے ہوشی کا انجکشن لگائے۔ بعد میں ہم بتادینگے۔''

ان لڑکیوں کا علاج کرنے میں پورا دن گزر گیا۔ دن بھر میں سوچتا رہا کہ ان سیدھے سادھے اور ملنسار لوگوں کو کس آفت نے آج گھیر لیا اور یہ مصیبت ان پر کیوں ٹوٹ پڑی۔ دن ڈھلنے کے ساتھ ساتھ تقریباً تمام لڑکیاں اپنی اصلی حالت میں آگئیں۔ میں کوارٹر میں چلا گیا۔ چائے وغیرہ پینے کے بعد میں بیڈ پر تھکان دور کرنے کے لئے لیٹنے ہی والا تھا کہ گاؤں کا بزرگ ماسٹر اپنی جوان سال بیٹی کو ساتھ لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ میں اس دلدوز واقع کی وجوہات جاننے کے لئے ویسے ہی بے قرار تھا اس لئے میں جلد ہی پوچھ بیٹھا ''ماسٹر جی! یہ کیا ماجرا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔ میں اس گاؤں میں ہمیشہ انسان دوستی' بھائی چارہ' امن وامان اور انسانیت ساز ماحول دیکھتا آیا......لیکن......؟''

ماسٹر جی میری بات کاٹتے ہوئے روتے روتے کہنے لگا۔

''یہ میری جوان بیٹی ہے۔ یہ لگ بھگ پچیس برس کی ہے جن دوسری لڑکیوں کا علاج کرنے میں دن بھر آپ مصروف رہے۔ وہ چالیس لڑکیاں بھی تقریباً اسی عمر کی ہیں۔''

''لیکن ان سب لڑکیوں کی یہ حالت آج ہی کے دن ایک ساتھ کیسے ہوئی؟''
میں نے ماسٹر جی کو کرسی پر بٹھاتے ہوئے پوچھا۔

میرے پوچھنے پر ماسٹر جی کی بیٹی زار وقطار رونے لگی اور اپنے لوگوں کی درد بھری کہانی سنانے لگی۔

''ڈاکٹر صاحب آج ''یوم فتح'' کی تاریخ ہے۔ آج ہی کے دن ہمارا عظیم گلستان غیروں کی غلامی سے آزاد ہوا ہے۔ اسی دن...... ہاں......اسی یوم فتح کے دن ......بیس سالہ پہلے' جب میری عمر سولہ برس تھی ہم لوگ یوم فتح کا جشن منا رہے تھے' اپنے والد صاحب کے ساتھ ایک مہینے تک میں گاؤں کی لڑکیوں کو یوم فتح کے دن پروگرام پیش کرنے کی تیاریوں میں مصروف رہی۔ یوم فتح کی تقریب منانے کے سلسلے میں تمام گاؤں والے اسپتال کے وسیع احاطے میں موجود تھے۔ گلستان کے پاسبان اسٹیج پر بیٹھے ہوئے تھے۔ فتح کا پرچم لہرایا گیا۔ ہر طرف خوشی کا سماں تھا۔ میں گاؤں کی لڑکیوں کو فتح کے گیت پڑھا رہی تھی۔ لڑکیاں بھی ترنم کے ساتھ بلند آواز میں ''دیکھو ہمارا یہ گلستان جس کی ہم ہیں کلیاں'' گا رہی تھیں کہ اچانک زوردار زلزلہ آیا۔ بہت سارے گاؤں والے اور کچھ پاسبان اس زلزلے میں مر گئے۔ چار سو سناٹا چھا گیا۔ ہم یوم فتح کا جشن منا رہے تھے کسی کو معلوم نہیں تھا کہ زلزلہ کیسے ہوا۔ تمام پاسبان حواس باختہ ہو گئے۔ جو لوگ ابھی تک اسٹیج پر ہماری امن پرستی کی قسمیں کھا رہے تھے۔ اچانک انہیں ہم سب سے بڑے امن دشمن نظر آنے لگے۔ تمام بستی کھنڈرات میں تبدیل ہو گئی۔ گلستان کے پاسبانوں نے سرعام لوٹ مار اور بربریت کا ننگا ناچ کھیلا اور نازک کلیوں کو ظالم گلچیں نے مسل کر رکھ دیا۔'' ماسٹر جی کی بیٹی اس انسانیت سوز سانحہ کا ذکر کرتے ہوئے بے ہوش ہوئی اور فرش پر گر پڑی۔ ہم

نے اُسے بیڈ پر لیٹا دیا۔''ڈاکٹر صاحب! یہ ہے اس سانحہ کی روداد۔'' ماسٹر جی نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔''پچھلے بیس برسوں سے گاؤں میں کسی بھی لڑکی کی ڈولی نہیں اٹھی کیونکہ گلستان کے دلیر پاسبانوں نے ان کی عزت لوٹ کر جو سیاہ دھبے ان کے پاک دامن پر لگا دیئے۔زمانے کی گردش نے ابھی تک وہ صاف نہیں کئے۔یہی وجہ ہے کہ پچھلے 20 برسوں سے ظلم کا شکار ہوئی ہماری لڑکیاں یوم فتح کے دن اپنے حواس کھو بیٹھتی ہیں اور ہمیں مجبوراً انہیں رسیوں سے جکڑنا پڑتا ہے۔'' ماسٹر جی کی بیٹی بے ہوشی کے عالم میں ''دیکھو ہمارا گلستان جس کی ہم ہیں کلیاں'' گا رہی تھیں۔مجھے ایسا لگا کہ وہ آج محبت سے نہیں بلکہ نفرت کی وجہ سے یہ پڑھ رہی ہے اور اُسکے دل میں انتقام کا آتش فشاں پک رہا ہے۔

کیا کہوں کس طرح سر بازار
عصمتوں کے دیے بجھائے گئے
(ناصر کاظمی)

..................☆☆☆..................

نشیب وفراز

وہ ذہین تھا اور باہمت بھی' اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اپنے علاقے کا پہلا گریجویٹ تھا۔ ہائی اسکول سے لے کر کالج تک وہ اپنی قابلیت کے جوہر دکھا چکا تھا لیکن اب وہ چاہتے ہوئے بھی مزید تعلیم حاصل نہیں کرسکتا کیونکہ وہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے والدین باہمت تو تھے لیکن سفید پوش بھی تھے۔ ان کے پاس کچھ بھی نہ تھا' ایک منزلہ پرانا بوسیدہ مکان' اس کے والدین کی کل پونجی تھی۔ خود منظور استاد بننا چاہتا تھا' پڑھ لکھ کر جو حاصل کیا تھا وہ دوسروں کے ساتھ بانٹنا چاہتا تھا۔ خود تو اُس کے گھر میں اندھیرا تھا لیکن وہ اپنے علم کے نور سے دوسروں کے گھروں کو منور کرنا چاہتا تھا۔ استاد بننا اُس کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ اس بارے میں صرف سوچ سکتا تھا کیونکہ سوچ انسان کے دماغ سے تعلق رکھتی ہے۔ کوشش تو وہ کرتا رہا۔ درخواستیں بھی دیتا رہا' انٹرویوز میں بھی شامل ہوتا رہا' ممکنات کو ناممکنات اور ناممکنات کو ممکنات میں تبدیل ہوتے بھی دیکھتا رہا....! لیکن ......آنے والے ہر لمحے کے ساتھ وہ گھبرا اٹھتا' اس کی ہمت اور ذہانت جواب دینے لگتی اور پھر اوراتیج ہونے کا خوف اور ڈر......اب کی بار وہ اپنے گھر سے بہت دور چلا آیا تھا' انٹرویو میں شامل ہونے کے لئے ......اُستاد بننے کے لئے ......لیکن اس انٹرویو میں اُس نے

بہت اچھی کارکردگی دکھائی۔سب سے الگ......سب سے اعلیٰ....اسے یقین تھا کہ اب کی بار استاد بننے میں اسے کوئی نہیں روک سکتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔یقین تو انسانوں پر کیا جاسکتا ہے پتھروں پر نہیں' بندے جب خدا بن جاتے ہیں تو سارے نظام میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔نتائج نکلے' لسٹ میں اپنا نام نہ دیکھ کر وہ حیران تو نہ ہوا لیکن مایوس ضرور ہوا۔انٹرویو لینے والوں نے اس کے لئے جو شیریں الفاظ دہرائے تھے وہ زہر ہلاہل کی طرح اس کے شریانوں میں خون کے بدلے گردش کررہے تھے۔اسے قوم کا روشن ستارہ کہنے والوں کے چہروں سے مصنوعی نقاب اتر چکا تھا۔ان کے اصلی چہرے اب منظور کے سامنے تھے......!

گھر لوٹتے سمے وہ سوچ رہا تھا خودکشی کے بارے میں' اس وحشی نظام سے بغاوت کرنے کے بارے میں ......وہ سوچ رہا تھا کہ جو لوگ رشوت' بے ایمانی اور لوٹ کھسوٹ جیسی برائیوں کو سماج سے ختم کرنے کے لئے بڑی بڑی اور سماج سُدھار محفلوں میں مہمانِ خصوصی ہوتے ہیں' دراصل ان میں بیشتر لوگ ہی ان برائیوں کو پھیلاتے ہیں' دھوکہ دہی' ضمیر فروشی اور بے ایمانی اُن کی زندگی کے حصے ہیں' ان کے اصول ہیں......!

ٹوٹتے قدموں سے جب وہ گھر پہنچا تو اُس کے چہرے پر چھائی اُداسی سے سارے گاؤں والے بھی اُداس ہوگئے۔سارے گاؤں میں مایوس کُن خاموشی چھاگئی لیکن ایک بزرگ نے یہ کہتے ہوئے خاموشی توڑ دی......''منظور اُستاد بنے گا۔''

''وہ کیسے؟'' کسی نے پوچھا۔

''ہم اپنے گاؤں میں اسکول کھولیں گے......وہ ہمارے بچوں کو پڑھائے گا۔''

''یہ کیسے ممکن ہے'اس کے لئے پیسہ چاہئے' روپیہ چاہئے۔'' کسی اور نے جاننا چاہا۔

''اس کا انتظام ہم سب مل جل کر کریں گے۔''

تمام گاؤں والوں نے چندہ جمع کیا۔عورتوں نے اپنے گہنے پیش کئے اور اس طرح سے ایک اسکول کی بنیاد پڑ گئی۔

بیس برس کے بعد وہ چھوٹا سا اسکول اب ایک ہائی اسکول میں تبدیل ہو چکا ہے اور منظور اس اسکول میں آج ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے کام کر رہا ہے......اب اس گاؤں کی نئی نسل میں کوئی ان پڑھ نہیں' گنوار نہیں' منظور کی ذہانت' محنت' شجاعت اور قابلیت سے سارا گاؤں تعلیمی نور سے منور ہو چکا ہے......!!

..................☆☆☆..................

قتل، قاتل اور مقتول

گولیوں سے چھلنی لاش صحن میں پڑی تھی۔ اُس کی اندھی ماں اور ضعیف باپ بیٹے کے قتل کی منحوس خبر سنتے ہی اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھے تھے۔ بیوی کے آنکھوں سے گرنے والے محبت و جدائی کے آنسو اپنے شوہر کے خون آلودہ چہرے کو صاف کرتے ہوئے قاتلوں سے فریاد کرر ہے تھے کہ ان کے بے گناہ شوہر کو کس بناء پر اس بے دردی کے ساتھ قتل کیا گیا۔ اُس کی چار سالہ پھول جیسی بیٹی اپنے باپ کی لاش سے چمٹ گئی تھی اور ان حالات سے بے خبر کہ اُسے اب یتیم کہا جائے گا اپنے باپ سے سیب مانگ رہی تھی۔

وہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور اپنے والدین کی مفلسی کی وجہ سے اسے اپنی تعلیم کے آٹھویں دروازے پر ہی تالا لگانا پڑا۔ آٹھویں جماعت پاس کرنے کے بعد جب اُس نے اپنے آس پاس نظریں دوڑائیں تو اسے احساس ہوا کہ بچپن کا حسین سفر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی مٹھی میں قید ہو چکا ہے اور اب جو سفر شروع ہو چکا ہے وہ بے حد دشوار اور کٹھن ہے، اپنی دیکھ ریکھ کے ساتھ ساتھ اب والدین کی دیکھ بھال بھی اس کی ذمہ داری بن چکی ہے۔ یہ دنیا جو سب کے لئے وسیع ہے اس کے

لئے سکڑ چکی ہے' گھر سے کھیت کھلیانوں تک سمٹ چکی ہے۔اپنا اور اپنے ضعیف والدین کا پیٹ بھرنے کے لئے وہ صبح سے شام اترنے تک دوسروں کے کھیتوں میں کام کرتا تھا۔کبھی کبھار جنگلوں کی جانب بھی چل پڑتا اور قریب کے جنگل سے جلانے کی لکڑیوں کا ایک انبار اپنے کاندھوں پر لاد کر شہر جا کر فروخت کرتا اور اُن پیسوں سے گھر کی ضروریات کی چیزیں خرید کر لاتا ...... ان جنگلوں میں جا کر اسے عجیب سا سکون ملتا تھا۔یہاں کی ہریالی میں اُسے زندگی کی سچائی نظر آتی تھی۔

لیکن ......ایک روز ......سب کچھ بدل گیا۔وقت کب بدلے گا انسان کی سوچ سے باہر ہے۔زندگی کی سچائی جل کر راکھ ہوئی' نہ صرف غفار کے لئے بلکہ سب کے لئے' اس کے گاؤں کے لئے' اس کی وادی کے لئے ......خوف و ڈر کے اندھیاروں نے وادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا' اجالوں کو چاہنے والے تاریکیوں میں ڈوب گئے......ایک آواز ابھری' یہ آواز سب کے لئے نئی تھی....اجنبی تھی....یہ آواز بندوق سے نکلنے والی گولی کی تھی....!جس کے سامنے سب بے بس دکھائی دے رہے تھے۔

یہ آواز سن کر غفار بھی ڈر گیا....سہم گیا......سہما سہما' ڈرا ڈرا سا وہ قریب کے جنگلوں میں جاتا رہا' لکڑیوں کی تلاش میں' ہریالی کی تلاش میں ......وہ دھان کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں بھی جاتا رہا...لیکن یہ ڈر اور خوف....اس ڈر اور خوف سے نہ تو وہ اپنا پیٹ بھر سکتا تھا اور نہ ہی اپنے گھر والوں کا......!

اُس شام چاروں اور سناٹا سا چھایا ہوا تھا' آفتاب کب کا غروب ہو چکا تھا' وہ فصل کاٹتے کاٹتے تھک چکا تھا اور اب گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔اُس نے جونہی سیبوں سے بھرا تھیلا ہاتھ میں اٹھایا تو اُس کے سامنے کچھ لوگ ہتھیار تھامے ہوئے نمودار ہو گئے اور غفار کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

''کون ہوتم'' وہ خوف زدہ ہوکر چلاتا رہا۔

''آزادی کے متوالے''ایک آواز سنائی دی۔

''آزادی' کیسی......آزادی......کس کی آزادی......اگر تم واقعی آزادی کے متوالے ہوتو مجھے کیوں اپنی گرفت میں لے لیا...... مجھے آزاد کرو اور مجھے گھر جانے دو......''

''نہیں ہم دہشت گرد ہیں۔'' دوسری آزاد سنائی دی ''ہمارا ایک ہی مقصد ہے' زندگی چھیننا' لہلہاتے کھیتوں کو مسمار کرنا۔''

''نہیں ان کھیتوں کو مسمار مت کرو......شاید تم بھوک سے واقف نہیں' بھوک جب بڑھتی ہے تو جرم بھی بڑھتا ہے۔''

''ہم نہ تو دہشت گرد ہیں اور نہ ہی آزادی کے متوالے'' تیسری آواز آئی ''ہم تم لوگوں کی حفاظت کے لئے آئے ہیں۔''

''کیسی حفاظت کرتے ہوتم......کون کرتا ہے یہ خون خرابہ......تمہاری بندوقیں یہ کیسی آگ اُگلتی ہیں کہ معصوموں کو جلا کر ہمیشہ کے لئے فنا کر دیتی ہیں......''

''ختم کرڈالو اس کو'' تینوں آوازیں ایک ساتھ سنائی دیں... یہ مخبر ہے...سب کی خبر رکھتا ہے' سب کی باتیں سنتا ہے''

لیکن مخبری کس کے لئے کرتا ہے یہ کوئی نہیں جانتا۔

''نہیں میں مخبر نہیں ہوں' میں ایک کھیت مزدور ہوں۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو......کہاں چھپا رکھے ہیں ہتھیار؟''

''میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے' صرف ایک درانتی' گھاس کاٹنے والی درانتی۔''

دوسری صبح خون میں لت پت غفار کی لاش ان ہی کھیتوں میں ملی' اُس نے اپنے ہاتھوں میں درانتی کی جگہ بندوق تھام رکھتی تھی۔

..................☆☆☆..................

مقبول

جنتِ نظیر کا وہ اسیر پرندہ...... بے بسی و بے کسی کا کفن اوڑھے......ظالم دیوؤں کی کالی کوٹھری کی سلاخوں والی روزن سے جب ابھرتے سورج کی آزاد شاعوں کو ضو افشانی کرتے ہوئے دیکھتا تھا تو وہ آزادی کے خواب کو حقیقت میں بدلتے ہوئے محسوس کرتا تھا۔ آزادی ...... ہاں ...... آزادی ...... اپنے وطن کے خوبصورت چمنستانوں کی آزادی‘ فلک بوس پہاڑوں کی آزادی‘ آب حیات جیسی تاثیر رکھنے والے آبشاروں کی آزادی......اپنے محکوم و مظلوم ہم وطنوں کی آزادی....جن کے ذہن ظلم و ستم کے پہاڑوں تلے دب گئے ہیں۔ جن کی دھڑکنوں پر خوف و دہشت کے پہرے بٹھادئے گئے اور جن کے پُر خون آنسوؤں سے ظُلم کے ایوانوں کے چراغ روشن کئے جارہے ہیں۔ وہ گمنامی کے عالم میں ایک گمنام وطن پرست سپاہی کی طرح وطن پرستی کا حق ادا کر رہا تھا۔ وہ ایک مقصد کے تحت اس پر کٹھن راستے پر چل پڑا تھا۔ ہر ستم اُس کے حوصلے کو بڑھاوا دیتا تھا۔ اس کا مقصد اُس کے اعتماد کے سہارے مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جارہا تھا اور اس کے اعتماد کی بنیاد اُس کے ایمان پر تھی۔ اپنے ساتھیوں کو وہ ہمیشہ یہی پیغام دیتا رہتا کہ وہ جس ایمان پر قائم ہیں اُس نے صدیوں پہلے انسان کو انسان کی غلامی سے آزاد ہونے کا منشور پیش کیا تھا۔ زندان کی

زنجیروں کا بوجھ،اُس کے ایمان واعتماد کے وزن کو بڑھاتا رہتا۔اسکی زندگی سلسلہ وار ان تہہ خانوں میں ہی گزری تھی لیکن اس نے کبھی بھی اپنے مشن کوسودابازی کے ترازو میں نہیں تولا۔

وہ ایک باشعور تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔پولیٹکس میں ڈگری یافتہ ہونے کی وجہ سے وہ سیاسی طور بالغ نظر انسان تھا۔وہ محکوموں کی المناک داستان سے بھی باخبر تھا اور حاکموں کے عشرت خانوں کی خوشحالی سے واقف بھی۔وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ آزاد قومیں ہمیشہ خودداری اور پُر اعتمادی کے ساتھ ارتقاء کی منزلیں طے کرتی رہتی ہیں اور ان کی نسلیں،فاتحانہ سوچ کے ساتھ آگے کی جانب قدم بڑھاتی ہیں۔وہ جب روزنِ زنداں کی سلاخیں دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر باہر کے اور دیکھتا تو اُسے پھانسی کے پھندے کے درمیان چمکتا ہوا سورج دکھائی دیتا تھا اور جب سورج کی روشن کرنیں اُس کی خواب پسند آنکھوں سے ٹکراتی تھیں تو اس کے بیدار ذہن میں اپنی محکوم وادیٔ کا آزاد جغرافیہ گھومنا شروع ہوجاتا۔وہ گھنٹوں سوچتا رہتا کہ اس کی قوم خواب غفلت میں پڑی ہوئی ہیں اور غلامی کا دیمک ان کے ذہن سے آزاد پسندی کی روح کو کُور کُور کر نکال رہا ہے لیکن وہ اس بات سے زیادہ پریشاں نہیں ہوتا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ طویل غلامی کا لمبا سانپ غلاموں کی آزادی پسندی کے مزاج کو اس قدر ڈستے ڈستے کڑوا بنادیتا ہے کہ وہ آزادی کی مٹھاس سے دستبردار ہوجاتے ہیں اور ان کی آزاد فکر پر غلامی کی دبیز چادر بیٹھ جاتی ہے۔جس کی وجہ سے وہ غلامانہ ذہنیت کے مالک بن جاتے ہیں۔وہ اپنی قوم کی غفلت شعاری سے پریشان تو ہوجاتا لیکن اس کا اعتماد اُسے مایوسی سے بچاتا تھا اور اس کی نظریں اپنی قوم کی نئی نسل پر ٹکی رہتیں،جن کے لئے اُس نے آزادی کے پُل کی بنیاد ڈالی تھی۔

وہ کافی عرصہ سے جمہوریت کے قید خانے کا قیدی بنا ہوا تھا۔ جمہوریت کے دعویداروں کی نظروں میں وہ ملک دشمن باغی تھا کیونکہ ان کے نزدیک وہ خفیہ طور پر آزادی کے مشن کو پھیلانے کی کوشش کرتا رہتا اور نوجوان نسل کے ذہنوں میں آزادی کی روح پھونک دیتا۔ سیاہ وسفید کے مالک فاتح اس کے منصوبے کو بھانپ چکے تھے ۔انھوں نے اس کی آزادی پسند سوچ کو ہر ممکن بدلنے کی کوشش کی لیکن جب ظلم وستم کے تمام ہتھکنڈے ناکام ثابت ہوئے تو اُس پر ملک دشمنی کا مصنوعی لیبل لگایا گیا اور پھانسی کی سزا تجویز کی گئی....لیکن موت کی سزا سننے کے باوجود بھی اُس کی ہمت کبھی نہیں ٹوٹی اور وہ آزادی کے مشن پر مضبوط چٹان کی طرح ڈٹا رہا۔

وہ دن ...... اُس کی انقلابی زندگی کا آخری دن تھا جب جدید دور کے جمہوریت پرست چنگیز نے اپنی چنگیزیت کا بھرپور مظاہرہ کر کے غلام وادیٔ کے آزاد پسند انسان کو تختۂ دار پر لٹکا دیا۔ نیا سورج طلوع ہو رہا تھا۔ اس کی چمکتی کرنوں نے آہستہ آہستہ سخت گرمی کی منجمد فضا میں آگ کے شعلے بھڑکا دیئے۔ بے حس قوم کے احساس جاگ اٹھے اور بیداری کی گرم لہر چارسو پھیل گئی۔ تمام قوم پل بنانے میں جُٹ گئی۔ طوفان کی خونین لہروں نے مشن چلانے والوں کو نگلنا شروع کر دیا لیکن ان کے انقلابی قدم آگے بڑھتے گئے اور ان کے انقلاب آفریں صداؤں سے ساری وادی گونجنے لگی۔ خوفناک بجلیاں کڑکنے لگیں لیکن انقلابی آواز کی زنجیر لمبی ہوتی گئی۔ ہر دل سے صدا نکل رہی تھی مقبول، مقبول...... تیرا مشن ہمیں قبول......!!!!

ڈپریشن

شبِ ظلمات کا نصف سے زیادہ حصہ بیت گیا تھا۔صابر کی ماں نے لالٹین کی بتی جلائی اور صابر کو نیند سے جگاتے ہوئے کہنے لگی ''صابر بیٹا اُٹھو نا' جلدی کرو نہیں تو دیر ہو جائے گی' پھر شہر کیسے جاؤ گے۔''

صابر تیس برس کا نوجوان...... پوسٹ گریجویٹ......عجیب قسم کے ذہنی تناؤ کا شکار......شہر جانے والی گاڑی خوفناک آواز میں ہارن بجا بجا کر سواریوں کو اپنی طرف بلا رہی تھی۔لوگ گھپ اندھیرے میں بس کی طرف دوڑے جا رہے تھے۔صابر جب گاڑی میں سوار ہوا تو گاڑی سواریوں سے کھچا کھچ بھری پڑی تھی۔اُسے مشکل سے بیک سیٹ پہ جگہ مل گئی۔سانسیں درست کرنے کے بعد اُس نے بغل والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی سے کہا:

''بڑی مشکل سے سیٹ مل گئی۔حاکم الوقت عوام کی مشکلات کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتے' ہر وقت پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔'' بغل میں بیٹھا آدمی قریباً ستر برس کی عمر کا تھا۔وہ صابر کی بات سُن کر بڑی سنجیدگی سے بولا:

''نوجوان! ہم کون سا کام اپنی مرضی کے مطابق کر سکتے ہیں۔نصف صدی سے لوگ اس بس میں سفر کرتے آئے ہیں۔اس زنگ آلود بس کے زہر آلودہ ماحول میں سفر کرتے ہوئے دم گھٹتا ہے۔نہ جانے کتنے مسافر منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی

اس بس میں دم توڑ بیٹھے۔ خیر آپ شہر کیوں جا رہے ہیں۔ آپ کے چہرے سے تو پسینے چھوٹ رہے ہیں خیریت ہے نا؟''

''جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے تب سے میں عجیب وغریب ذہنی تناؤ میں مبتلا ہوں'' صابر نے درد بھری آواز میں کہا ''سنا ہے کہ شہر کے ایک اسپتال میں دنیا کے پانچ بڑے ماہرین نفسیات نے ایک بڑا کیمپ لگایا ہے۔ جہاں پر وہ ڈپریشن کے شکار انسانوں کا نفسیاتی معائینہ کرتے ہیں تا کہ وہ ذہنی تناؤ سے چھٹکارہ پا کر سکون کی سانس لے سکیں۔''

اسی دوران ڈرائیور اور کنڈیکٹر بس میں نمودار ہو گئے۔ ڈرائیور کے ماتھے پر لمبا سرخ ٹیکا تھا اور کنڈیکٹر کے چہرے پر لمبی داڑھی تھی۔ دونوں کے ہاتھ میں ایک ایک لمبا کوڑا تھا......بس شہر کی جانب چل پڑی' ہر طرف خوف کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ موسم اگر چہ خوشگوار تھا' پرندے بھی آزاد فضاؤں میں اُڑ رہے تھے لیکن بس کی بدبودار فضا سے مسافر سخت کوفت محسوس کر رہے تھے۔ گھٹن سے تنگ آ کر کچھ نوجوانوں نے بس کی چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں کو کھولنے کی کوشش کی تا کہ سڑک کے دونوں جانب پھیلی ہوئی پہاڑیوں سے آ رہی ٹھنڈی اور خوشبودار ہوائیں مسافروں کی گھٹن کم کر سکیں۔ لیکن ......ابھی نوجوان کھڑکیاں کھولنے ہی لگے تھے کہ اچانک بس رُک گئی اور ڈرائیور اور کنڈیکٹر نے ان نوجوانوں پر کوڑے برسانا شروع کر دئے۔ بس میں افراتفری مچ گئی۔ بہت سارے نوجوان' بوڑھے' بچے اور عورتیں کوڑوں کی مار سے اپنی جانیں گنوا بیٹھے۔ ہر طرف خون ہی خون نظر آ رہا تھا اور بس ایک جیل کا انٹروگیشن سیل محسوس ہو رہی تھی۔ یہ وحشت ناک صورت حال دیکھ کر صابر کو دل کا دورہ پڑنے لگا۔ اُسے محسوس ہونے لگا کہ بس کی پٹرول ٹینکی میں ان لوگوں کا خون جمع ہو رہا ہے اور اُسی خون سے

بس آگے بڑھ رہی ہے۔

یہ سوچتے سوچتے صابرکو اپنے اسکول کے دن یاد آئے جب وہ پانچویں میں پڑھتا تھااور ماسٹر جی روزانھیں مارننگ اسمبلی میں ایک نظم پڑھاتا تھا''ہم ہونگے کامیاب ......ہم ہونگے کامیاب ......ایک دن ......'' صابر نے ایک روزمعصومانہ لہجے میں ماسٹر جی سے پوچھا تھا کہ ماسٹر جی اس نظم کا مطلب کیا ہے؟'' ماسٹر جی نے بڑے پیار سے سمجھایا تھا'' بیٹھا جب تم پڑھ لکھ کر بڑے ہوجاؤ گےتو تمہیں اپنے لئے اور اپنے وطن کے لئے بہت کچھ کرنا پڑے گا تاکہ تمہارا وطن ترقی کر سکے اور لوگ آزادی کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔'' صابر سوچتا رہا......سوچتا رہا کہ ابھی ہمیں ہماری منزل نہیں ملی ہے......ہمیں اور آگے بڑھنا ہے۔

بس شہر پہنچ گئی۔صابر نے بس سے اتر کر سیدھے اسپتال کی راہ لی۔اسپتال میں وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ بس کے تمام مسافر نفسیاتی مرض میں مبتلا تھے اور وہ علاج کے لئے قطار میں کھڑے اپنی اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں۔صابر بھی قطار میں شامل ہوگیا۔وہ تمام چہروں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ایک عورت پاگل پن کا شکار لگ رہی تھی وہ چلا چلا کر دردناک آواز میں اپنے لڑکے کا نام لے رہی تھی اور کبھی کبھی بے ہوش ہوجاتی تھی کچھ لوگ اُسے زور سے پکڑے ہوئے تھے۔صابر نے اس عورت کی قابل رحم حالت دیکھ کر ان لوگوں سے پوچھا کہ'' اس عورت کی یہ حالت کیسے ہوئی ہے۔اُسے ایسا کون سا صدمہ پڑا ہے جس سے یہ اپنا دماغی توازن تک کھوبیٹھی ہے۔''

ان لوگوں میں سے ایک آدمی نے اُس عورت کی درد بھری کہانی سناتے ہوئے کہا۔

'' نوجوان ! اس عورت کا ایک جوان لڑکا تھا......اُس نے اچھی خاصی تعلیم

حاصل کی تھی۔ وہ اپنے علاقے کے لوگوں کو خوشحال دیکھنا چاہتا تھا اور ان کی مشکلات کو دور کرنا چاہتا تھا۔ وہ لوگوں کو بیدار کرنے کا متمنی تھا تاکہ ان کی آنے والی نسل آزاد فضاؤں میں سانس لے سکے۔ لوگ اُس بہادر اور انقلاب پسند نوجوان کے خیالات اور عزائم سے اتفاق کرنے لگے۔ ایک دن اُس نے اپنے علاقے کے لئے نئی بس لائی۔ لوگ اُس بس جوق در جوق سوار ہوتے گئے لیکن ابھی بس چند ہی میل کا سفر طے کر چکی تھی کہ برسوں پرانی چلنے والی بس کا ڈرائیور سڑک پر نمودار ہوا اور اُس نے بہادر نوجوان کو بس سے اتار کر کوڑے مار مار کر ابدی نیند سُلا دیا۔''

یہ درد بھری کہانی سن کر صابر کا سر چکرانے لگا اُس نے کھڑکی کھولی اور تازہ ہوا کے جھونکوں میں لمبی لمبی سانسیں لینے کی کوشش کی۔ اُسے یوں لگا کہ باہر سارے شہر میں آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ آسمان سے خون کی بارش ہو رہی ہے......لوگوں کی چیخ و پکار سے ساری وادی لرز رہی ہے......اور دور سڑک کے کنارا اُس کا وہ بوڑھا ماسٹر جی بھی خون میں لت پت پڑا ہوا ہے جو اُسے بچپن میں ''ہم ہونگے کامیاب'' کی نظم پڑھایا کرتا تھا۔ یہ حواس باختہ صورتحال دیکھ کر صابر کا صبر بھی ٹوٹ گیا اور کچھ دیر بعد اس کی سسکیاں چیخ و پکار میں مل گئی اور اُس کا ڈپریشن......!!!

..................☆☆☆..................

تیسری جنگ عظیم سے قبل

وہ سنگ دل گلچیں ......اپنے پُر فریب محدّب شیشوں کی زہریلی شاعوں سے ......گلِ زمین کے لالہ فام پھولوں کو اپنا نشانہ بنا رہے تھے۔ چمنستان کے شاہین فطرت پرندے‘ ان مردہ خور کرگسوں کی بدطینت خصلت بھانپ گئے اور اپنے چمنستان کو ان مردہ خوروں کی پروازوں سے آزاد کرانے کے لئے کمر بستہ ہو گئے۔ چمنستان کے یہ شاہین جب ان مردہ خور کرگسوں کا مقابلہ کرنے کے لئے پر تولنے لگے تو اسیر فضا حیران......درندے پریشان......لیکن چند سے کیا ہوتا‘ وہ شکار بننے والے غافل پرندوں کو مدد کے لئے پکارتے رہے‘ اتحاد کی صدائیں دیتے رہے لیکن سب فضول......آپسی پھوٹ کی وجہ سے سب بزدل نکلے......موت سے خوف زدہ ‘خودداری سے محروم......!

یہ شاہین فطرت پرندے ایک درخشان تہذیب کی نمائندہ علامت تھے۔ وہ تہذیب جس سے جدید دنیا کے سوتے پھوٹے تھے۔ وہ اسی پرامن‘ خوشحال اور پائیدار تہذیب کے پروردہ شاہین تھے۔ ان کے چمن میں ہر طرف خوشحالی کا دور دورا تھا۔ چمن کی فضا امن وسکون کی خوشبوؤں سے مہک رہی تھی۔ باغی پرندوں کے گلستان کی یہ معطر ہوائیں‘ ان بدمست درندوں کو دیوانہ کر بیٹھیں۔ انھوں نے اپنی

عفونت زدہ سانسوں کو ان خوشبودار فضاؤں میں تحلیل کرنا اور اپنی بدصورت جونچوں سے آزاد چمن کے نرم و نازک پھولوں کو توڑنا شروع کر دیا۔ چمن کے شاہین اپنے پُر امن چمن کو ان درندہ صفت کرگسوں کی تباہی سے بچانے کی خاطر مقابلہ کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوئے۔ کافی عرصہ تک وہ پوری طاقت کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے۔ کہتے ہیں کہ دولومڑیوں نے بھی ایک خونخوار شیر کو مار گرایا تھا' یہاں تو جدید دور کے طاقت ور درندوں کے ساتھ مقابلہ کرنا تھا۔ انجام تو سب کو معلوم تھا' وہ بھی بے خبر نہیں تھے لیکن وہ خوددار تھے' باغیرت تھے' ان کی خودداری اور غیرت مندی نے انھیں جھکنے نہیں دیا۔ انھوں نے پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے ان درندوں کے سازشی آشیانوں کو بھی تباہ کر ڈالا' لیکن اس سب کے باوجود وہ فتح مندی کا سورج نہیں دیکھ سکے۔ ان کی نسل نے جب انھیں تنہا چھوڑ دیا تو وہ اپنے محفوظ ٹھکانوں میں پناہ لینے کے لئے مجبور ہوگئے۔ ان کی غافل نسل دور سے کھیل کا نظارہ کرتے ہوئے لطف اندوز ہو رہی تھی...نتیجہ......ان کے آزاد چمن امن کے دعویداروں کے غلام بن گئے۔

غلاموں کی لگام کسنے کا کام بڑے درندے نے اپنے ہاتھ میں لے لیا وہ ابھی بے قرار تھا۔ اُس کا سکون جنون میں تبدیل ہو رہا تھا کیونکہ باغی پرندوں کا سردار شاہین' اُس کی پکڑ سے باہر تھا اور اسے سزا نہ دینا اُس کے مغرور دماغ پر کوڑے برسنے کے مترادف تھا۔ تلاش جاری رہی۔ چمنستان کی اینٹ سے اینٹ بجائی گئیں۔ کئی باغی پرندے شکار ہوئے اور کئی شکاری کے زہریلے پھندے میں پھنس گئے۔ انھیں درندے کی عدالتی پنجروں میں لایا گیا اور انھیں اپنے مقاصد کو بیان کرنے کا حکم ہوا۔ وہ شاہین فطرت پرندے موت کے پنجروں میں پھڑ پھڑانے لگے کہ

''ہم آزاد چمن کے اسیر پرندے ہیں۔ ہم اپنے چمن کو آزاد دیکھنا پسند کرتے

ہیں......ہمیں غلامی سے سخت نفرت ہیں......ہم ہر کسی کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں......
ہم غلامی کی ذلت آمیز زندگی پر آزادی کی باعزت موت کو ترجیح دیتے ہیں......''

مغرور درندے، شاہینوں کے عزائم دیکھ کر غُرائے:

''آزادی دینا اور چھیننا ہمارا حق ہے کیونکہ ہم آزاد ہیں......طاقت ور ہیں......امن کے پیامبر ہیں......جمہوریت کے علمبردار ہیں......تم غلاموں کی یہ ہمت کہ تم ہمارے خلاف بغاوت پر اتر آئے......تمہاری نسل کی سانسیں ہمارے رحم و کرم پر چل رہی ہیں۔''

باغی شاہینوں کو جب موت کی سزا سنائی گئی تو بھی وہ آزادی آزادی پکارتے رہے۔ ان کی گردن میں جب پھانسی کا پھندا ڈالا گیا تو ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے شبنمی قطرے چمک رہے تھے۔ درندوں کا سردار خوشی سے چہک رہا تھا۔ وہ اپنی تہذیب کے گن گا رہا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ آج وہ اس نسل سے صدیوں کا بدلہ لے رہا ہے لیکن وہ پھر بھی کبھی کبھی مایوس ہو رہا تھا کیونکہ ان باغی پرندوں کا سردار ابھی ان کے ہاتھ نہیں لگا تھا۔ باغی پرندوں کی نسل کے کچھ پرندے خاموش احتجاج کرتے رہے، انھوں نے غلامی کی ذلت دیکھی تھی وہ احتجاج کے بغیر کرتے بھی کیا کیونکہ غلام کے پاس احتجاج کے بغیر ہوتا ہی کیا ہے۔

زمانہ گردش کرتا رہا...... برسوں گزر گئے ...... وقت کا مزاج بدلتا رہا......
درندروں میں پھوٹ پڑ گئی کیونکہ بڑا درندہ دوسرے درندوں پر اپنا تسلط جمانا چاہتا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرانے لگے......سارا جنگل آگ برسانے لگا......تمام خون خوار درندوں کے ٹھکانے اس آگ کی لپیٹ میں آگے...... ہر طرف بربادی اور تباہی پھیل چکی تھی کیونکہ دنیا میں تیسری جنگ عظیم کا سائرن بج چکا تھا۔

ہوم لینڈ

ڈاکٹر ریاض توحیدی

وہ جنت نماوادی تھی ۔اس کے پاسبان برف سے ڈھکے ہوئے ......آسمان کے حریف بلند و بالا خاموش پہاڑ تھے۔ بہار کے موسم میں جب سورج کی کرنیں ان برفیلے پہاڑوں پر پڑتی تھیں تو برف پگھل کر ٹھنڈے پانی میں تبدیل ہوکر بلندی سے پستی کی طرف مدھم آواز میں دھیرے دھیرے سفر شروع کرتی تھی اوراس گلپوش وادی کے چمن زاروں کے رنگ برنگے پھولوں کے لئے آب حیات کا کام انجام دیتی۔ یہ وادی ایک منفرد تہذیب وثقافت کا مسکن رہی تھی جو صدیوں کی تاریخ پر مشتمل تھا۔ لوگ مختلف مذاہب کے پیروکار تھے لیکن انسانیت نوازی سب کا مشترکہ مذہب تھا۔ عبداللہ خان‘ سوم ناتھ اور سردار سرجیت سنگھ...ہندو‘مسلم اور سکھ اتحاد کی پائیدار علامت تھے۔ان لوگوں نے زندگی کی ستر بہاریں دیکھی تھیں ۔ یہ ایک ہی گاؤں میں رہتے تھے اور زمانے کے نشیب وفراز میں بھی یہ لوگ اتحاد واتفاق کی بے مثل علامت تھے۔ الگ الگ مذہب سے تعلق رکھنے کے باوجود یہ لوگ ایک ہی کنویں سے پانی پیتے تھے اور ایک ہی کھیوٹ سے فصل اُ گاتے تھے۔ گاؤں میں ایک بہت بڑا صدیوں پرانا چنار تھا۔ یہ تینوں اس چنار کے سائے میں غم روزگار پر گفتگو کرتے رہتے ۔ یہ چنار اس علاقے کے لوگوں کا صدیوں پرانا ورثہ تھا اور امن کی علامت بھی‘ کیونکہ جب بھی بستی

میں بدامنی کا کوئی واقعہ پیش آتا تھا تو بستی کے لوگ مل جل کر اس چنار کے سائے میں بیٹھ کر بدامنی کو امن میں تبدیل کرتے تھے۔

عبداللہ، سوم ناتھ اور سردار سرجیت سنگھ بچپن کے ساتھی تھے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بے حد محبت کرتے، محبت کی یہ روایت بزرگوں کی دین تھی۔ گاؤں میں جب بھی کوئی مذہبی تہوار ہوتا تو مشکل سے ہی پہچان ہوتی کہ یہ کس مذہب کا تہوار ہے کیونکہ سب لوگ ہر تہوار مشترکہ طور پر مناتے تھے اور آپسی بھائی چارے کا یہ عالم تھا کہ جب سوم ناتھ کی شادی رچائی گئی تو سوم ناتھ کے ساتھ عبداللہ خان اور سردار سرجیت سنگھ ہی اس کے سسرال گئے تھے اور دلہن کو سجا کر ڈولی میں لائے تھے۔

ایک دن ...... گھنے چنار کے سائے......سوم ناتھ نے بھائی چارے کی اس مضبوط روایت کو یہ کہہ کر توڑ ڈالا کہ ''وہ یہ وادی چھوڑ رہا ہے۔'' عبداللہ خان اور سرجیت سنگھ یہ خلاف توقع والی بات سن کر دم بخود ہو گئے۔ انھیں محسوس ہوا کہ اس بڑے چنار کی ایک پرانی شاخ کو خزاں کے سایوں نے اپنی لپٹ میں لینا شروع کیا ہے۔ عبداللہ خان نے غصے میں آ کر سوم ناتھ سے پوچھا!

''سوم ناتھ! آپ کیوں اس صدیوں کے بھائی چارے کو توڑنا چاہتے ہو؟ تم ہمیں چھوڑ کر مت جا۔''

''نہیں عبداللہ بھائی''سوم ناتھ نے درد بھری آواز میں کہا''ہم کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔ ہمیں اپنوں سے سندیش ملا ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے تم وادی چھوڑ کے چلے آؤ۔ میرا دل بھی اس جنم بھومی کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہے لیکن جب برادری کے دوسرے لوگ بھاگ رہے ہیں تو میں یہاں اکیلا کیا کروں گا۔''

سوم ناتھ کی یہ باتیں سن کر سردار سرجیت سنگھ آگ بگولہ ہو گیا اور تلوار ہوا میں

لہراتے ہوئے بول پڑا!

''سومے! ہم لوگ صدیوں سے اکٹھا رہتے آئے ہیں۔ ہمارے بزرگ بھی ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے' کس کی مجال ہے جو ہم کو جدا کرے اور ہمیں اپنے گھروں سے بے گھر کردے۔ مجھے بھی اپنوں سے پیغام آیا تھا لیکن میں نے جانے سے انکار کر دیا۔ ہم تینوں آنے والے طوفان کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔''

سوم ناتھ خیالات کے سمندر میں کھو گیا۔ اس کو سکھ دکھ کے وہ دن یاد آ گئے جو ان تینوں نے ایک ساتھ گزارے تھے۔ اسے برسوں پہلے کا وہ واقعہ بھی یاد آیا جب قبائلوں نے وادی پر حملہ کر دیا تھا اور عبداللہ خان نے اس کے خاندان کو ایک مہینے تک اپنے گھر میں رکھا تھا تا کہ ان پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔ سوم ناتھ نے عبداللہ خان کے چہرے کی طرف جب دیکھا تو اُسے عبداللہ خان کا وہ احسان بھی یاد آیا جب اسپتال میں اس کے بیٹے کو بچانے کے لئے عبداللہ خان نے اپنا خون پیش کیا تھا۔ شام ڈھلتے ہی تینوں دوست اپنے اپنے گھروں کی طرف لوٹ چلے۔

صبح سویرے عبداللہ خان چنار کے سایہ تلے ان دونوں ہم وطنوں کا انتظار کرتا رہا۔ کافی دیر کے بعد سردار سرجیت سنگھ نمودار ہوا۔ سردار نے جب سوم ناتھ کو وہاں نہیں پایا تو وہ دونوں ایک دوسرے کو حیرت سے تکنے لگے۔ دونوں سوم ناتھ کے گھر کی طرف چل پڑے۔ وہاں ہر طرف خاموشی تھی' گھر کے دروازے پر تالا چڑھا ہوا تھا۔ سوم ناتھ رات کے اندھیرے میں بھائی چارے کی صدیوں پرانی زنجیر کو کاٹ کر پہاڑی کی دوسری جانب فرار ہو کر اپنوں کے پاس چلا گیا تھا۔ لیکن وہ یہ سچائی بھول بیٹھا تھا کہ پیڑ جب اپنی زمین سے اکھڑ جاتا ہے تو پرائی زمین اُس کی جڑوں کو پھلنے پھولنے نہیں دیتی ہے۔ سوم ناتھ کی گائے بدحواسی کے عالم میں صحن کے اندر چکر کاٹ

رہی تھی۔عبداللہ خان،سوم ناتھ کی گائے کوامانت سمجھ کرگھر لے آیا۔

وقت گزرتا رہا۔دن مہینے اور مہینے برسوں میں تبدیل ہوتے گئے۔وادی میں ہرطرف خوف ودہشت کا ماحول چھایا ہوا تھا۔وطن کی آن بچانے کی خاطر سینکڑوں لوگوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ہزاروں گھر جلائے گئے‘راتیں موت کا منظر پیش کرتی رہیں اوردن میدان جنگ کا سماں!گھر سے نکلنے کے بعد کسی کو یہ امید نہیں ہوتی تھی کہ وہ دوبارہ گھر زندہ آئے گا یا نہیں؟اس سب کے باوجود عبداللہ خان اور سردار سرجیت سنگھ کا بھائی چارہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔

چند برسوں کے بعد عبداللہ خان کے نام سوم ناتھ کی ایک چھٹی آئی۔عبداللہ خان چھٹی لے کرسردار سرجیت سنگھ کے گھر چلا گیا۔سردار چھٹی کھول کر پڑھنے لگا۔سوم ناتھ نے عبداللہ خان کولکھا تھا:

’’مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی جو میں نے دوسروں کے بہکاوے میں آکر اپنے آپ کومصیبت کے بھنور میں جھونک دیا۔وہاں آپ لوگ ہماری بہو بیٹیوں کی عزت بھی کرتے تھے اورحفاظت بھی!لیکن یہاں جنہیں ہم اپنا سمجھتے رہے وہ ہماری بہو بیٹیوں کی طرف ہوس بھری نظروں سے دیکھتے ہیں اورہمیں مائیگرنٹ کہہ کر ہر مقام پرذلیل کرتے رہتے ہیں۔‘‘

عبداللہ خان اورسرجیت سنگھ خط پڑھتے پڑھتے بڑی دیرتک روتے رہے۔سوم ناتھ نے عبداللہ خان کومزید لکھا تھا:

’’عبداللہ اگرآپ مجھ پررحم کھاؤ گےتو میرا آبائی مکان جلا ڈالوتا کہ میں سرکار سے معاوضہ لےسکوں اورانشورنس کمپنی سے پیسے وصول کرلوں اورمیری زمین بھی بیچ ڈالو کیونکہ میرے بیٹے پرتھوی کوآرمی میں آفیسر کا عہدہ مل گیا ہے‘اس لئے اب اسے

ٹریننگ پر جانا ہے جس کے لئے مجھے پیسوں کی اشد ضرورت ہے۔آپ کا مجھ پر اور میرے بیٹے پر بڑا احسان رہے گا۔اگر آپ میرا یہ کام کرو گے۔''

عبداللہ خان نے گھر آ کر اپنے بیٹے غزنوی سے مشورہ کیا کہ''سوم ناتھ کا مکان' ان کی امانت ہے' اسے ہم کیسے جلا سکتے ہیں' وہ اگر واپس آئیں گے تو کہاں رہیں گے۔اس کے بدلے میرے پاس کچھ پیسے ہیں اور سوم ناتھ کی آدھی زمین ہم بیچ ڈالیں گے۔'' چند دنوں کے اندر عبداللہ خان نے سوم ناتھ کو پیسے بھیج دیئے۔ایک مہینے کے بعد سومناتھ کا ایک پارسل عبداللہ خان کو پہنچ گیا' جس میں زمین کے کاغذات کے علاوہ ایک چھٹی بھی تھی جس میں سوم ناتھ نے لکھا تھا کہ''ہم لوگ آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھولیں گے۔پرتھوی نے نوکری جوائن کر لی، یہ سب آپ کی مخلصانہ مدد سے ہوا۔''

ایک رات سوم ناتھ کے گھر سے اچانک آگ نمودار ہوئی۔تمام گاؤں والے آگ بجھانے کے لئے دوڑ پڑے لیکن آگ پر قابو نہ پا سکے۔کچھ مہینوں کے بعد سردار سرجیت سنگھ کو سوم ناتھ کا ایک خط موصول ہوا' جس میں لکھا تھا کہ میں نے مکان کا انشورنس کمپنی سے حاصل کر لیا ہے اور سرکار کی طرف سے معاوضہ بھی ملا ہے۔اب تم مکان والی زمین خرید لو' کاغذات میں چند دنوں کے اندر بھیج دوں گا۔سرجیت سنگھ نے زمین خرید کر اس پر ایک عالیشان مکان تعمیر کروایا اور کچھ ہی برسوں میں سوم ناتھ کی زمین پر ایک قصبہ نما گاؤں تعمیر ہوا۔

تقریباً بیس برس گزر گئے۔وادی کے حالات اب کچھ حد تک سدھر گئے تھے۔ایک روز لوگ جب صبح سویرے نیند سے جاگے تو سارے علاقے کو فوج نے اپنے گھیرے میں لیا تھا۔دوپہر کے وقت کریک ڈاون کا اعلان ہوا اور تمام لوگوں کو اپنے

اپنے گھروں سے بھیڑ بکریوں کی طرح نکالا گیا اور ایک کھلے میدان میں جمع کیا گیا۔ فوج کا افسر جب بڑے رعب داب کے ساتھ لوگوں کے سامنے کھڑا ہو گیا تو لوگ خوش بھی ہوئے اور حیران بھی۔ یہ افسر سوم ناتھ کا لڑکا پرتھوی تھا۔ پرتھوی مائک ہاتھ میں اٹھائے لوگوں سے مخاطب ہوا:

''ہم لوگ پچھلے بیس برسوں سے جن بدترین حالات کا شکار ہوتے آئے ہیں' اس کے ذمہ دار تم لوگ ہو۔ تم ہی لوگوں نے ہمیں اپنے گھروں سے بے گھر کر دیا۔ ہمارے مکان جلائے' ہماری زمینوں پر ناجائز قبضہ کر ڈالا۔ اب ہم واپس آنا چاہتے ہی۔ ہم تم لوگوں کو ایک مہینے کی مہلت دیتے ہیں' تم لوگ ہماری زمینوں کو چھوڑ دو...... یہاں پر ہمارا ہوم لینڈ بنے گا۔''

لوگ پرتھوی کی دل آزار باتوں سے برہم ہو گئے۔ عبداللہ خان لاٹھی کے سہارے پرتھوی کی طرف بڑھ گیا اور اُسے سمجھانے لگا کہ ''بیٹا تم لوگ ضرور واپس آؤ لیکن ہم پر غلط الزامات مت لگاؤ۔'' یہ سنتے ہی پرتھوی نے اپنے گن سے عبداللہ خان کے دو دانت توڑ دیئے۔ لوگ پرتھوی کی وحشیانہ حرکت دیکھ کر آگ بگولہ ہو گئے۔ ہر طرف شور مچا۔ ظلم کے خلاف نعرے بلند ہو گئے،۔ بھیڑ میں عبداللہ خان کا لڑکا غزنوی کھڑا ہو گیا۔ وہ پرتھوی سے جارحانہ لہجے میں کہنے لگا:

''تم لوگ اپنی جنم بھومی کو دھوکہ دے کر اور صدیوں کے بھائی چارے کو توڑ کر یہاں سے فرار ہوئے ہو۔ تم لوگوں نے خود اپنے مکان جلوائے اور اپنی زمین ہمیں بیچ ڈالی۔ تم لوگوں نے اس پوتر دھرتی کو تیاگ دیا۔ اب ہم لوگوں کے راستے الگ ہو چکے ہیں۔''

یہ سنتے ہی فوجی لوگوں پر ٹوٹ پڑے۔ سینکڑوں لوگ زخمی ہو گئے۔ پرتھوی

لوگوں کو ایک مہینے کی مہلت دے کر وہاں سے چل دیا۔

ایک مہینے کے بعد پرتھوی جب اس علاقے میں دوبارہ آ گیا تو وہاں کا ماحول بدل چکا تھا۔بستی کے چوراہے پر ایک بڑا بورڈ لگایا گیا تھا جس پر سبز حروف سے آزاد لینڈ لکھا ہوا تھا اور علاقے کے نوجوان اپنے ہاتھوں میں ہتھیار تھامے ہوئے تھے جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ حالات...... !!!

..................☆☆☆..................

کشمیر نواز

زمینِ حُسن خیز کی پرسکون وجان بخش فضائیں ......قرنوں سے......کالے دیوؤں کے آسیب سے سحر زدہ ہورہی تھیں۔ یہ آفت زدہ وادی، کشمیر نواز کے سنہرے خوابوں کی حسین تعبیر تھی اور اُس کی ستم زدہ نسل، ایک مدت سے، کالے دیوؤں کے حکم جابری کی تابعداری کرتے ہوئے، جھیل ولر کی منجمد سطح کے اوپر ننگے بدن ننگے آسمان تلے سرما کی جان لیوا سردی میں برف کے بُت بنی ہوئی تھی۔ سرما کی برف باری کی وجہ سے 'جھیل ڈل' کا پانی جم گیا تھا اور اس ٹھٹھرتی سردی میں کالے دیؤ وادی کے باشندوں کو اپنے عذاب سے تڑپا رہے تھے۔ جھیل ڈل کی اس یخ بستہ سطح پر وہ لوگ بر فیلے پیڑ جیسے لگ رہے تھے۔ کالے دیوؤں کا ڈر ان لوگوں کے دلوں میں اس طرح سے بیٹھ گیا تھا کہ ہونٹوں پر جمی ہوئی برف کو چوسنے سے بھی خوف محسوس ہو رہا تھا۔ کشمیر نواز اپنی برفیلی جسم والی نردوش نسل کی بے بسی دیکھ کر اندر ہی اندر ٹوٹ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اُس کی اس خوب صورت پھولوں بھری وادی کے مالی کب تک برف کے یہ سفید کفن اوڑھے رہیں گے۔ کون انھیں ان کالے دیوؤں کے آسیب سے نجات دلائے گا۔ اب کوئی ''کشف ریشی'' نہیں آئے گا......کوئی کشف ریشی نہیں

......! کشمیرنواز کا ذہن یہ سوچتے سوچتے ماضی کی بھول بھلیوں میں کھو گیا۔

ماضی کے پردوں میں کشمیرنواز کو وہ دور نظر آیا جب وادی کے چاروں طرف پانی ہی پانی پھیلا ہوا تھا اور لوگ کشتیوں میں زندگی گزارتے تھے۔ لوگ زیادہ تر مچھلیوں کا شکار کرتے تھے اور آرام سے زندگی گزارتے تھے۔ اس زمانے کے کالے دیوؤں کو ان لوگوں کی خوشحالی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اس لئے وہ آہستہ آہستہ وادی کے لوگوں کو ستانے پر اتر آئے۔ کالے دیورات کے اندھیرے میں لوگوں کے گھروں پر شب خون مارتے تھے اور ان کے معصوم بچوں کو اپنے والدین سے زبردستی چھین کر جھیل ڈل کے گہرے پانی میں پھینک دیتے تھے۔ وادی کے لوگ جب ان کالے دیوؤں کے جور وستم سے تنگ آ گئے تو شب خیزی میں نکلنے والی اُن کی مظلوم آہوں کا درد اُس زمانے کے پیغمبر حضرت سلیمانؑ نے محسوس کیا، وہ ان مظلوموں کی فریادرسی کے لئے اپنے تخت پر سوار ہو کر وادی کی جانب آیا اور اپنا اُڑن کھٹولا کوہ سلیمانی پر ٹھرایا۔ لوگ جوگ درجوگ حضرت سلیمان کے پاس اپنی فریاد لے کر پہنچے اور انھیں کالے دیوؤں کے ظلم و ستم کی روداد سُنائی۔ لوگوں کی فریاد سُن کر حضرت سلیمان نے تمام جنات کو حکم دیا کہ آج سے وہ کسی بھی آدم زاد کو نہیں ستائینگے اور جو مظالم ان دیوؤں نے آج تک وادی کے لوگوں پر ڈھائے تھے، سزا کے طور پر انھیں وادی میں موجود سارے پانی کو نکالنے کا حکم دیا جاتا۔ لوگوں نے حضرت سلیمانؑ کا شکریہ ادا کیا اور اُسے اُس وقت کی زبان میں ''کشف ریشی'' کے نام سے یاد رکھا۔

کشمیرنواز کی سوچ ابھی ماضی کے واقعات میں ہی گم تھی کہ اچانک اُسے ہر طرف چیخ و پکار سنائی دی۔ اُس نے جب آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ کالے دیو اُس کی نوجوان نسل پر آگ کے کوڑے برسا رہے ہیں۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ اگر یہ لوگ اسی

طرح ظلم سہتے رہینگے تو میری یہ خوابوں کی وادی معصوم آوازوں کا مدفن بنتی جائے گی۔ وہ کوہِ سلیمانی کی جانب دوڑ پڑا۔ پہاڑ کے اوپر پہنچ کر وہ اُس جگہ کو کھودنے لگا جہاں پر ماضی میں حضرت سلیمانؑ کا اڑن کھٹولا ٹھہرا تھا۔ زمین کھودتے ہوئے اس کے ہاتھ حضرت سلیمان کی جادوئی انگوٹھی لگ گئی ۔ اس نے انگوٹھی کو کڑاہی میں پگھلا یا اور سینکڑوں نئی انگوٹھیاں بنا ڈالیں ۔ وہ ان انگوٹھیوں کو پہاڑ سے نیچے پھینکتا گیا اور وادی کے ستم رسیدہ لوگوں کے حوصلوں کو بڑھاتا رہا۔ اس کی آواز ہر طرف گونج رہی تھی وہ اپنے لوگوں سے کہہ رہا تھا کہ ''جاگو! ان انگوٹھیوں کو پہنو......اپنے سرد پڑے خون میں حرارت بھر دو......آگ کے بدلے آگ بن جاؤ''......!!

تمام لوگوں کے منجمد جسم حرکت میں آنے لگے۔ انگوٹھیاں پہنتے ہی ان کے اندر ایک نئی حرارت پیدا ہوئی اور ان کے برفیلے کفن پگھلنے لگے۔ وہ ایک نئے جوش اور ایک نئے ولوے کے ساتھ ان کالے دیوؤں پر ٹوٹ پڑے۔ انگاروں سے انگارے ٹکرانے لگے۔ کشمیرنواز پہاڑ پر اپنی نسل کی جرأت کو دادِ تحسین پیش کر رہا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ برسوں کے بعد اس کی وادی سے جابرانہ اقتدار کا خاتمہ ہو رہا ہے اور کالے دیو پسپائی کے عالم میں خوف زدہ ہو کر پہاڑی کے غاروں کی طرف بھاگ رہے ہیں۔

..................☆☆☆..................

کبھی الوداع نا کہنا

فصل گل کی عنبریں فضاؤں میں پہلگام کے برف پوش کہساروں کی یخ بستہ سلوں کو جب سورج کی تپتی کرنیں اپنی تپش سے چیرنا شروع کر دیتی ہیں تو پہاڑوں کی فرازی سے جھر جھر کرتے ہوئے ٹھنڈے آبشار نشیب میں منتظر پیاسی سرسبز وادی کے لئے آب حیات کے مترادف ہوتے ہیں۔اور دنیا کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے سیلانی اپنی پیاس بجھاتے وقت ان برفیلے پہاڑوں کو قدرت کے سولر ریفریجرٹر (Solar Refrigerator) کے طور پر محسوس کرتے ہیں۔وہ دونوں...... پہلگام کے ان برفانی پہاڑیوں کے سرسبز اور شاداب دامن میں تین سال بعد جُدا ہو رہے تھے۔ان کی بہار کے سر پر خزاں کا سایہ منڈلا رہا تھا۔ان دونوں کے جدائی کے گرم گرم آنسوؤں سے تیز دھار ندی کے بہاؤ میں اضافہ ہو رہا تھا۔کالج کے لڑکے اور لڑکیاں ان مست فضاؤں میں ایسے جھوم رہے تھے کہ جیسے بہشت کی قمریاں اور آزاد چمن کے بلبل ہوں۔ساجد اور ساجدہ ندی کے کنارے گُم سُم بیٹھے آنے والے طوفان کے کرب سے لرز رہے تھے۔ان خوش گوار نظاروں میں جہاں ہر ایک کالج اسٹوڈنٹ چہک رہا تھا وہاں ساجدہ کے ہونٹوں سے سرد آہ کے ساتھ کسی دل جلے شاعر کا یہ شعر نکل رہا تھا۔

برفیلی ہوائیں ہیں، برفیلی فضائیں ہیں
اک ہم ہیں ستم رسیدہ؛ اس پر یہ ادائیں ہیں

''یہ محبت ہم دونوں کی زندگی میں ایک حسین خواب کی طرح کیوں آئی...؟''
ساجدہ نے ساجد کے کاندھے پر سر رکھ کر روتے بلکتے مایوس لہجے میں کہا''
کیوں تقدیر ہمیں زہریلی جدائی کا غم سہنے پر مجبور کر رہی ہے۔''
ساجد یہ سنکر جذباتی ہو کر بول پڑا۔

''محبت......محبت......اس کی حقیقت اُسی کے ذہن میں اثر انداز ہوسکتی ہے جس کو زندگی میں اس حسین بھلا سے واسطہ پڑا ہو۔ ہمارے والدین ذہنی طور پر سماجی رسم ورواج کے اسیر ہیں۔ وہ شادی بیاہ کو ایک سماجی رسم سمجھتے ہیں نہ کہ دو دلوں کا ملن۔ وہ اپنی خاندانی روایت کو فخر کے جھوٹے پردے میں آگے بڑھاتے ہوئے ہمارے معصوم ارمانوں کا خون کر رہے ہیں۔''

تین برس ان دونوں کے لئے تین صدیوں کے مانند تھے۔ یہ دونوں کالج کے بیتے ہوئے دنوں کی رسیلی یادوں میں کھو گئے۔ ان کی پہلی ملاقات کالج کے پہلے دن کالج لائبریری میں ہوئی تھی۔ پہلے پہلے دونوں ایک دوسرے کو خاموش نگاہوں سے تکتے رہے لیکن چند مہینوں میں ان کی دوری قربت میں تبدیل ہوتی گئی اور وہ ایک دوسرے کو مخصوص انداز سے سمجھنے لگے۔ ساتھ ساتھ مطالعہ کرنے کے علاوہ یہ دونوں سمیناروں میں بھی اکٹھا حصہ لیتے لگے اور کلاسز بھی ایک ساتھ ایٹنڈ کرتے رہتے۔ دو سال کے اندر وہ ایک دوسرے کے جذبات واحساسات کو اچھی طرح سمجھ پائے تھے اور تیسرے سال یعنی گریجویشن کے آخری سال دونوں نے ڈگری حاصل کرنے کے

بعد اپنی محبت کو شادی کے بندھن میں باندھنے کے سنہرے خواب دیکھنے شروع کئے۔

لیکن یہ خواب اسوقت سراب دکھائی دیا جب ایک دن ساجد کی ماں نے اسے کہا کہ تمہارے ابا جان نے تیری شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ یہ سنتے ہی ساجد کا سر چکرانے لگا۔ ''مجھ سے پوچھے بغیر میری شادی کا فیصلہ'' ساجد نے جذباتی انداز میں کہا ''اور ہاں! لڑکی پڑھی لکھی ہے یا ان پڑھ......'' ''ان پڑھ ہے ان پڑھ! کچھ بھی نہیں پڑھا ہے'' ساجد کا باپ یہ کہتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ تو ابھی کماتا نہیں ہے لیکن پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ابھی میری ریٹائرمنٹ ہونے تک پندرہ برس کا عرصہ ہے'' باپ کے یہ فرسودہ خیالات ساجد کے سر پر ہتھوڑا مارنے کے برابر تھے۔

''ابا جان! کمانے والی بات نہیں ہے۔ میرے بھی کچھ خواب ہیں' کچھ خواہشیں ہیں......شادی تو ضرور کرنی ہے لیکن میں اپنی پسند کے مطابق کسی پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کرونگا''۔ یہ کہتے ہوئے ساجد نے اپنا سر جھکا لیا۔

''تمہارے خواب......تمہاری خواہشیں......ہمیں ان سے کچھ لینا دینا نہیں۔'' ساجد کے باپ نے دھمکی بھرے انداز میں کہا ''میں نے تمہارا رشتہ اپنے ایک رشتہ دار کے ہاں طے کرلیا ہے۔ اگر تم نے انکار کر دیا تو سماج میں میری کیا عزت رہے گی۔''

''ابا جان! شادی کا معاملہ زندگی سے جڑا ہوتا ہے۔ یہ آنے والی نسل کا مسئلہ ہوتا ہے۔'' ساجد گھر والوں کو سمجھانے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ چند دنوں کے بعد ساجد کے باپ نے اپنی جھوٹی انا کی خاطر ساجد کے جذبات اور خواہشات کا سودا کر کے شادی کی تاریخ مقرر کر ڈالی۔

اُس دن ساجد پہلگام کی حسین وادی میں ندی کنارے ساجدہ کو اپنی محبت کا بے رحم انجام سناتے سناتے جدائی کے درد سے اندر ہی اندر ٹوٹ رہا تھا۔ بے خودی کے عالم میں دونوں ندی کے اوپر والے پل کے درمیان چلتے چلتے پہنچ گئے۔ انھیں محسوس ہونے لگا کہ جیسے پہلگام کی برفیلی پہاڑیوں سے آگ کے شعلے بھڑک اٹھے اور برف پگھلنے سے ندی میں طغیانی آئی جس کی وجہ سے پل بیچ میں ٹوٹ گیا اور یہ دونوں ندی کے بہتے ہوئے پانی میں ڈوب گئے اور تیز دھار طوفان نے دونوں کو الگ الگ کناروں پر پھینک دیا۔

ساجد کی شادی کے بعد ساجدہ کی شادی بھی دوسرے شہر میں کردی گئی۔ دس سال بعد ساجد نے پی ایچ ڈی مکمل کرلیا اور اسی کالج میں بحیثیت لیکچرر تعینات ہوا جہاں سے اُس نے گریجویشن کی تھی۔ جوائن کرنے کے لئے جب وہ کالج کے آفس میں پہنچا تو وہ ساجدہ کو وہاں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ساجدہ بھی آج ہی جوائن کر چکی تھی۔ جوئینگ رپورٹ ڈالنے کے بعد وہ دونوں اسی پیڑ کے نیچے کرسیاں لگا کر بیٹھ گئے جہاں گریجویشن کے دنوں وہ سبزے پر بیٹھ کر فرصت کے لمحات میں اپنے حسین مستقبل کے خوابوں کے بارے میں سوچتے رہتے تھے۔ ''ساجد کیسے ہو؟'' ساجدہ نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا ''ان برسوں میں مجھ سے کبھی بھی ملنے کی کوشش نہیں کی۔''

''کس لئے ملنے کی کوشش کرتا'' ساجد نے سرد لہجے میں جواب دیا ''ہمیشہ اپنے مقدر پر رونا آتا ہے......تم اپنی سناؤ۔ کتنے بچے ہیں۔''

''ساجد ان دس برسوں میں بہت کچھ بدلا۔'' ساجدہ یہ کہتی ہوئی رو پڑی '' جس کے ساتھ میری شادی ہوئی تھی وہ بزنس......کرتا تھا اور مجھے اعلیٰ تعلیم کا شوق تھا

جس کے لئے وہ تیار نہیں تھا۔ گھر میں ہمیشہ لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے تھے اور قسمت نے چند ہی مہینوں میں ہم دونوں کو جُدا کر دیا۔ اب صرف تنہائی اور میں ......!''

کالج کے اسٹوڈنٹس نے دوسرے دن پہلگام جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ اسٹاف کی طرف سے ساجد اور ساجدہ کو اسٹوڈنٹس کے ساتھ روانہ کیا گیا۔ دونوں پہلگام پہنچ کر دس برس پہلی والی جگہ ندی کے کنارے بیٹھ گئے ۔فضا خوشگوار تھی ۔پھول مہک رہے تھے اور تتلیاں ان کے اردگرد چکر لگا رہی تھیں۔ندی کا پل آج بھی ٹوٹا پڑا تھا۔ دونوں کی نظریں ٹوٹے ہوئے پل پر مرکوز تھیں۔پل شاید سوچ رہا تھا کہ ان دونوں کی جدائی کی وجہ سے وہ ٹوٹ گیا تھا اور دس سال تک وہ اس لئے انتظار کرتا رہا کہ یہ دونوں اس کی دوبارہ تعمیر کا باعث بنیں گے۔ وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر پل کی طرف قدم بڑھانے لگے۔ پہلگام کی سرسبز وشاداب وادی میں پھر سے بہار اپنا جلوا دکھانے لگی ۔اور ہواؤں نے گلاب کے پھولوں سے ان دونوں کا سواگت کیا جس کے لئے وہ برسوں سے انتظار میں تھے۔ ریڈیو سے غزل چل رہی تھی ؎

مرے تخیل کی تنگ دنیا تیرے تصور سے ہے فروزاں
تجھے گماں ہے کہ میں ابھی تک تیری تمنا میں جی رہا ہوں

.................☆☆☆.................

اپنا سورج

بادصرصر اچانک نمودار ہوجاتی اور مہکتے چمن کے پھولوں کی سرخ گلابی پتیوں کو ریزہ ریزہ کر کے گردوغبار میں بکھیر دیتی۔ بادصرصر کی اس طوفانی آمد سے ڈر کر جب بچے اپنے بزرگوں سے پوچھتے کہ یہ تیز وتند ہوا گلابی موسم میں نمودار ہوکر ہمارے چمن کے خوبصورت پھولوں کو کیوں بھری جوانی میں فنا کے گھاٹ اتار دیتی ہے تو بزرگ لوگ اپنے بچوں کی سوچ کے مطابق جواب دیتے رہتے کہ ہماری وادی کا سورج اونچے اونچے پہاڑوں کے پیچھے پھیلی ہوئی ایک گہری کالی جھیل کے یخ بستہ دبیز تہوں میں پھنسا ہوا ہے اور شیش ناگ اپنے زہریلے پھنوں سے اُس کی چمکتی کرنوں کو دھویں میں تبدیل کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہمارے چمن تک اتنی ہی سورج کی دھوپ پہنچتی ہے جتنا شیش ناگ چاہتا ہے۔ اسی لئے جب بھی بادصرصر چاہتی ہے تو ہمارے چمن کی طرف رخ کرتی ہے اور یہاں تباہی مچاتی ہے۔

وہ جب کچی عمر کا تھا تو بادصرصر کی طوفانی آمد کے ساتھ ہی اُس کا دھیان بزرگوں کی سنائی ہوئی طلسماتی کہانی کی طرف فوراً چلا جاتا۔ بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ اس کی عقل میں بھی پختگی آنے لگی۔ وہ ہسٹری پڑھنے کا بڑا شوقین تھا کیونکہ بچپن سے اُس کے کان طلسماتی قصہ کہانیاں سنتے آئے تھے۔ ہسٹری پڑھنے کے ساتھ ساتھ

اُس کا ذہن جغرافیہ کی طرف بھی مائل ہوتا چلا گیا۔ وہ ہسٹری اور جغرافیہ میں کالی جھیل اور شیش ناگ کی حقیقت ڈھونڈتا رہا لیکن اُسے نہ کسی ہسٹری میں کسی خیالی جھیل کا ذکر ملتا اور نہ ہی جغرافیہ میں کسی شیش ناگ کا کوئی روپ نظر آتا تھا۔ وہ آزاد سوچ کا مالک تھا اور حقیقت پسند بھی۔ وہ سوچتا رہتا کہ جب سورج کے دھکتے شعلوں کو کوئی بھی جھیل سرد نہیں کرسکتی ہے اور نہ کسی شیش ناگ کے پھن اس کی چمکتی کرنوں کو کالا بنا سکتی ہے تو ہماری وادی کے موسم ہی کیوں یک رنگی کے شکار نظر آرہے ہیں۔ سورج تو روز آزادی کے ساتھ نیلے آسمان کے پردے پر ڈوبتا ابھرتا رہتا ہے اور دھرتی کے ذرے ذرے کو اپنی کرنوں سے چمکاتا رہتا ہے۔

وہ سوچتا رہا، سوچتا رہا۔ کئی دہائیوں تک سوچتا رہا اور سوچتے سوچتے وہ اونچے اونچے پہاڑوں پر چڑھتا گیا۔ پہاڑوں پر چڑھ کر وہ اپنے سورج کو ڈھونڈنے لگا۔ اُس کی نظریں کالی جھیل کے گہرے پانی پر پڑیں۔ جہاں پر اُس کا سورج جھیل کی دبیز تہوں میں مایوس چھپا ہوا تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے سورج کو اس جھیل کی جابرانہ تہوں سے آزاد کرے گا۔ اُس کی سوچ کے ساتھ دوسرے لوگوں کی سوچیں بھی شامل ہوگئیں اور یہ سوچیں فضائے بسیط میں پرواز کرنا لگیں۔ ان کی سوچیں ایک ساتھ اپنے ناخنوں سے جھیل کی دبیز تہوں کو کریدنے لگ گئیں۔ ان کی حِس ان سے کہہ رہی تھی کہ سخت سے سخت بادِ مخالف بھی متحدہ سوچ کی طاقت کو منتشر نہیں کرسکتی ہے۔

وہ لوگ اپنے پھنسے ہوئے سورج کو آزاد کرانے کے لئے اپنی متحدہ سوچ کے نوکیلے ناخنوں سے طلسماتی جھیل کے یخ بستہ تہوں کو کریدنے کی کوشش کرنے لگے اور کئی تہوں کو کرید کر جب شیش ناگ کی کینچلی پر نوکیلے ناخنوں کی ضربیں پڑھنے لگیں تو

شیش ناگ کے زہریلے پھنوں نے بادصرصر کا روپ دھار کر ان کے خوبصورت چمن پر حملہ کر دیا۔ بادصرصر کا زور اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ نہ صرف چمن کے رنگ برنگے پھول تباہ ہونے لگے بلکہ چمن کے پودے بھی جڑ سے اکھڑنے لگے۔ یہ خوفناک صورت حال دیکھ کر ان لوگوں کی ہمت ٹوٹنے لگی لیکن ان کے بزرگوں نے یہ کہہ کر ان کی ہمت بڑھائی کہ یہ بادصرصر برسوں سے ہمارے چمن زاروں کو برباد کرتے آئی ہے اگر آج آپ لوگوں نے اپنے سورج کو کالی جھیل کی دبیز تہوں کی غلامی سے آزاد نہیں کرایا تو ہمارا یہ چمن ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بادصرصر کے نشانے پر رہے گا اور کسی بھی پھول کو بھرپور کھلنے کا موقع نہیں ملے گا۔

بزرگوں کی حوصلہ افزا نصیحت سن کر ان لوگوں کی ہمت اور بڑھ گئی اور وہ لگا تار جھیل کی دبیز تہوں کو پھاڑنے لگ گئے۔ جھیل کا کالا پانی جب ندیوں کی صورت میں سفر کرنے لگا تو شیش ناگ کو اپنا زہریلا وجود خطرے میں نظر آنے لگا۔ وہ ان لوگوں کی متحدہ سوچوں کو ڈسنے پر اتر آیا۔ اُس نے کئی جوانوں کو جھیل کی گہرائی میں ڈبو کر مار ڈالا لیکن وہ لوگ اپنے سورج کی آزادی کے لئے کوشش کرتے رہے۔ بزرگوں نے بہت سارے بچوں کو شیش ناگ کے زہریلے پھنوں کا شکار ہوتے دیکھا تو انھوں نے بین بجانے شروع کر دئے۔ بین کی آواز ہر طرف گونجنے لگی اور شیش ناگ بین کی آواز پر مستی سے جھومنے لگا۔ شیش ناگ کو جھومتا دیکھ کر بزرگوں نے بہادر جوانوں کو حکم دیا کہ شیش ناگ کی کینچلی اکھیڑ دو۔ ان لوگوں نے شیش ناگ کی کینچلی اکھیڑنے کے ساتھ ساتھ اُس کے زہریلے دانتوں کو بھی توڑنا شروع کر دیا۔ جھیل کا کالا پانی آہستہ آہستہ کم ہوتا گیا اور ان کا اپنا سورج آہستہ آہستہ جھیل کی قید سے آزاد ہو کر اوپر چڑھتا گیا۔ جھیل کو خشک ہوتے دیکھ کر شیش ناگ زخمی حالت میں وہاں سے فرار ہوا اور ان کے

چمن میں بادصرصر کی بجائے بادصبا پھیلنے لگی۔سورج کی کرنیں آزادی کے ساتھ ان کے چمن کے پھولوں کی پتیوں پر جمے ہوئے شبنمی قطروں کو چمکانے لگیں۔بادصبا کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں سے سارے پھول نکھرنے لگے اور سارا چمن خوشی سے جھومنے لگا وہ دیکھ رہا تھا کہ چمن کے رنگ برنگے پھول اپنی نئی تاریخ رقم کر رہے ہیں جس میں نہ کسی کالی جھیل کا فسانہ تھا اور نہ کسی شیش ناگ کا قصہ......!!!''

..................☆☆☆..................

مسائل کے یزید

اُس نے پھر اپنے موجود ہونے کا احساس دلایا۔ کلاشنکوف کا گھوڑا دبا کر آن کی آن میں اپنے شکار کو ڈھیر کر ڈالا اور جلسے میں بھگدڑ کے دوران نہ جانے وہ بھی کہاں غائب ہو گیا۔ وہ کئی برسوں سے کسی بھی سیاسی جلسے میں اچانک نمودار ہوتا اور کسی خوفناک بھوکے شیر کی طرح چند ہی لمحوں میں اپنے شکار کا صفایا کر کے غائب ہو جاتا۔ قانون کے محافظ کئی دنوں تک اس کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے لیکن اپنی تمام تر کوشش کے باوجود جب وہ ناکام رہتے تو تھک ہار کر دوسرے معاملات کو نپٹانے میں لگ جاتے۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہے۔ کہاں سے آتا ہے۔ اکیلا ہے یا دوسرے لوگ بھی اُس کے ساتھ ملے ہوے ہیں۔ اُس کو بھی روپوشی کا عالم پسند تھا۔ وہ جب بھی اپنے مشن میں کامیاب ہو جاتا تو اُسے ایک مخصوص تسکین محسوس ہوتی تھی۔ وہ اس بات کی پرواہ نہیں کرتا تھا کہ عام لوگ اُس کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ جمہوریت میں عام لوگوں کی سوچ کو صرف استعمال کیا جاتا ہے' اس لئے لوگوں کا سوچنا یا نہ سوچنا ایک ہی معنی رکھتا ہے کیونکہ انھیں تو اپنے پیٹ کا غلام بنا کے رکھ دیا جاتا ہے۔ وہ کب آزادی کے ساتھ اپنی سوچ کا استعمال کر

سکتے ہیں۔کبھی کبھی وہ محسوس کرتا رہتا کہ عام لوگ شاید اُس کے مشن سے اتفاق کرتے ہیں اور چند افراد اس کی حرکت کو ناپسند بھی کرتے ہیں۔اتفاق کرنے والے لوگ اس کے مشن کو صحیح قرار دیتے رہتے کیونکہ ان کی نظر میں وہ انصاف کی لڑائی لڑ رہا ہے اور آج تک اُس کے ہاتھوں کسی بھی بے گناہ انسان کا قتل نہیں ہوا تھا۔لیکن چند لوگ اس کے برعکس رائے رکھتے تھے'ان کا کہنا تھا کہ وہ ایک سماج دشمن عنصر ہے'وہ اگر سمجھتا ہے کہ وہ اچھا کام کر رہا ہے تو اُسے قانون کا سہارا لینا چاہیے۔وہ سب لوگوں کی باتیں سنتا تھا اور خوشی اور ناراضگی کے بغیر صرف سوچتا رہتا...سوچتا رہتا....اپنے مشن کو مکمل کرنے کے بارے میں......''

کیا وہ فطرتاً باغی تھا......انسان کی سوچ کو بنانے یا بگاڑنے میں سماج کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔اگر سماج صالح قدروں کا پاسدار ہوگا تو اس ماحول کے پروردہ ذہن بھی تعمیری سوچ کے مالک ہونگے'برعکس اس کے اگر زمین کی چھاتی پر سرسبز اور شاداب پھل دار پودوں کے بدلے نوکدار جھاڑیاں اگائی جائیں تو انسان کو زخمی ہونا ہی پڑے گا۔وہ ایک سلیم الفطرت انسان تھا لیکن ماحوم نے اس کو باغی فطرت بنا دیا۔بچپن میں وہ ایک سرکاری اسکول میں پڑھتا تھا اور اپنی قابلیت کے بل پر ہمیشہ ٹاپ کرتا تھا لیکن اُس کے اُستاد ہمیشہ اول نمبر پر آنے کا سرکاری وظیفہ اپنے بچوں میں بانٹ دیتے تھے۔وہ اپنا حق دوسروں کے پاس جاتے ہوئے مایوس تو ہوتا تھا لیکن وہ بڑی ہنرمندی کے ساتھ ان بچوں سے اپنا حق واپس چھین لیتا تھا۔اس کے استاد جب وہ چند سکے اپنے بچوں کو دیتے تو وہ اُن کو گوٹیاں کھیلنے پر اکساتا تھا۔وہ گوٹیاں کھیلنے میں ماہر تھا اور چند دنوں کے اندر اندر گوٹیاں کھیلتے کھیلتے وہ تمام بچوں سے ایک ایک کر کے اپنا حق واپس لیتا تھا۔عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ تعلیم میں

بھی آگے بڑھتا گیا لیکن وظیفہ چھیننے کا وہ عمل اُسے زندگی کے ہر موڑ پر حق تلفی اور نا انصافی کی صورت میں دکھائی دیا۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اُسے یقین تھا کہ وہ اپنی محنت اور قابلیت کے بل پر لیکچرر بن جائے گا۔ کئی انٹرویوز دینے کے بعد بھی اُس کا خواب پورا نہ ہو سکا۔ کوئی بھی سلیکشن لسٹ بغیر سیاسی مداخلت کے نہیں بنتا تھا۔ اُس کی کمند اتنی لمبی نہیں تھی کہ وہ سیاسی ایوانوں کے اونچے کنگروں تک پہنچ پاتی۔

اُس کی عمر اب اورایج کی طرف بڑھ رہی تھی اور اس کی مایوسی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کے یار دوستوں اور رشتہ داروں نے یہ کہہ کر اُس کی ہمت بڑھا دی کہ وہ بھی کسی سیاسی لیڈر کے ہاتھ پر بیعت کرے۔ یہ مشورہ سنتے ہی اُس کے بدن میں آگ سی لگ گئی۔ وہ سوچنے لگا کہ آج تک ان سیاسی لیڈروں نے عوام کی خوشحالی کے لئے کونسا کارنامہ انجام دیا ہے۔ ہمارے سماج میں بھوک٬ غریبی اور اقتصادی بدحالی کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔ لیکن اُس کے جذبات تب سرد پڑ گئے جب وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگا۔ اُسے احساس ہو رہا تھا کہ اب اُسے آخری انٹرویو دینا ہے اور بغیر سیاسی مدد کے اُسے نوکری نہیں مل سکتی ہے٬ اس لئے اُس نے اپنی خودداری کا گلا گھونٹ کر مجبوراً ایک سیاسی لیڈر کا ساتھ دے دیا۔ الیکشن جیتنے کے بعد جب اُس نے سیاسی لیڈر کو اپنا وعدہ یاد دلایا تو وہ مکر گیا اور اس طرح سے وہ نوکری پانے کا آخری موقع بھی گنوا بیٹھا۔

اُسے لاچاری سے سخت نفرت تھی۔ چند برسوں تک بے کار بیٹھنے کے بعد اُس نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے الیکشن لڑا۔ کثیر تعداد میں لوگوں نے اُس کے حق میں ووٹ ڈالے لیکن نتائج آنے پر مسائل کے یزیدوں نے اُس کے آخری خواب کو بھی چکنا چور کر ڈالا۔ اعلان کرتے وقت کامیاب ہونے کے باوجود بھی اُس کے سر کو

ناکامی کے تاج سے نوازا گیا اور ایک مجرم کی طرح اُسے قید خانے میں بند کیا گیا۔

ایک عرصہ جیل میں گزارنے کے بعد جب وہ باہر آیا تو اُس کی تعمیری سوچ تخریبی لاوا میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ایک سلیم الفطرت انسان مکمل باغیانہ فطرت کا مالک بن چکا تھا۔ چند برسوں تک وہ خاموش رہا......گاؤں سے دور......اپنوں سے دور......وہ سوچتا رہا......حق تلفی اور ناانصافی پر سوچتا رہا......اور اُس نے بدلا لینے کی قسم کھائی......ان مسائل کے جڑ کو کاٹنے کی قسم کھائی۔ وہ صرف خود سے مشورہ کرتا رہتا کیونکہ اُس نے دوسروں کے تمام مشورے پہلے ہی قبول کر لئے تھے۔

اُس رات وہ بے چینی کے عالم میں ایک بھوکے شیر کی طرح اپنے کمرے میں چہل قدمی کرتا رہا۔ وہ سو نہیں پا رہا تھا کیونکہ اُس کی نیند پر مسائل کے یزیدوں نے کب کا شبخون مارا تھا۔ نئے دور کے یہ مسائلی یزید اقتدار پر قبضہ جمانے کے ساتھ ہی اپنے درباروں کو جنت نما بنا دیتے ہیں اور لوگوں کو مسائل کے کربلا میں جھونک دیتے ہیں۔ عوام کے بچے فرات کی ایک ایک بوند کے لئے ترستے رہتے ہیں اور ان کے بچے آب حیات سے بھی سیر نہیں ہو پاتے۔ وہ خود سے کہتا رہا کہ جدید دور کی یہ جمہوریت قدیم دور کی یزیدیت ہے۔......چنگیزیت ہے......سویرا ہوتے ہی وہ اپنے مشن پر روانہ ہوا۔ وہ اپنے آخری شکار کو ٹھکانے لگانے کے لئے چل پڑا۔ وہ شکار ......جس نے اُس کی مثبت سوچ کو منفی بنا دیا تھا......جس نے اُس کی زندگی برباد کر ڈالی تھی۔ وہ جب جلسہ گاہ میں پہنچا تو جمہوریت کا علمبردار......جمہوریت سے مرعوب مخلوق کے سامنے مکاری کے کرتب دکھا رہا تھا۔ وہ مائک پر گرج رہا تھا کہ ''وہ سماج کو غریبی، رشوت خوری، حق تلفی، بے انصافی اور دھنگا فساد کے خوفناک ماحول سے نجات دلائے گا۔'' لیڈر کی اس سیاسی بولی سے اُس کے بدن میں آگ سی لگ گئی۔ اُس نے

یہ سوچ کر سیاسی لیڈر کے سر کو کلاشنکوف کے نشانے پر رکھا کہ حقیقتاً اگر سماج سے غریبی، رشوت خوری، حق تلفی، ناانصافی اور دھنگا فساد وقتل وغارت کے ماحول کو ختم کرنا ہے تو کیوں نہ ان برائیوں کو پھیلانے کے ریموٹ کنٹرول کو ہی ختم کیا جائے۔ چند ہی لمحوں کے اندر......ایک تیز رفتار گولی...... لیڈر کی فسادی کھوپڑی میں گھس گئی اور فسادی ریموٹ کے پرخچے اڑ گئے۔ اُس نے راحت کی سانس لی۔ لوگ افراتفریح کے عالم میں چاروں اور بھاگنے لگے اور وہ بھی اپنا آخری شکار کھیل کر لوگوں کے جنگل میں غائب ہو گیا۔

..................☆☆☆..................

کالے پیڑوں کا جنگل

سورج ڈوبتے ہی بستی کے اندر کالے پیڑوں کا جنگل نمودار ہو جاتا۔ ان کالے پیڑوں کی آدمی خور شاخیں، آدم زاد کے قدموں کی آہٹ محسوس کرتے ہی آگ کے شعلے برسانا شروع کر دیتی تھیں اور جب اندھیری رات کا بھیانک سایہ بستی کے طول و عرض میں پھیل جاتا تو زندہ انسانوں کی چہکتی بستی شہر خموشاں کا نظارہ پیش کرتی تھی۔ خوف کے آسیب نے بستی کے پیرو جواں کے ذہنوں کو مفلوج بنا کے رکھ دیا تھا اور یہ لوگ طرح طرح کی نفسیاتی بیماریوں کے شکار ہو چکے تھے۔ کالے پیڑوں کی دہشت کی وجہ سے اندھیاری راتوں میں نہ کسی گھر میں روشنی چمکتی تھی اور نہ کوئی زبان اونچی آواز نکال سکتی تھی۔ لیکن! بچے ......معصوم بچے ...... اس خوف و دہشت سے نا آشنا...... جب کبھی ماں کی گود میں رونا شروع کرتے تو مائیں سر کے آنچل سے اُن کے منہ کو بند کر کے رکھتیں تاکہ باہر سے کوئی وحشیانہ دستک سنائی نہ دے۔ کوئی بھی انسان گھر سے باہر نکلنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا اور اگر کسی فرد کو مجبوراً گھر سے نکلنا پڑتا تو وہ آگ کے شعلوں کی نذر ہو جاتا۔ شب خون کا یہ سلسلہ اس بستی میں کئی دہائیوں سے جاری تھا۔

ایک منحوس رات جب تاجہ بیگم کے دودھ پیتے بچے کو اندھیرے میں بچھو نے ڈنک مارا تو وہ درد سے چیخنے لگا۔ بچے کو تڑپتا دیکھ کر رمضان چچا سخت پریشان ہو گیا۔ میاں بیوی نے اسپتال جانے کا مشورہ کیا۔ رمضان چچا نے لالٹین جلائی اور اسے ہاتھ میں لے کر گھر سے باہر نکل آیا۔ وہ تاریکی میں روتے روتے اونچی آواز میں کالے پیڑوں سے فریاد کرنے لگا۔

''مجھے اسپتال جانے دو! میرا بچہ درد سے مر رہا ہے۔''

یہ سنتے ہی آگ کے شعلے بھڑک اٹھے اور رمضان چچا کو اپنی لپیٹ میں لے کر بھسم کر ڈالا۔ تاجہ بیگم ابھی گھر سے باہر نہیں آئی تھی۔ اُن کے دوسرے بچے یہ اندوہ ناک منظر دیکھ کر نہ رو سکے اور نہ ہی تاجہ بیگم خاوند کی لاش کو دیکھ کر کچھ بول پائی۔ وہ رات بھر سسکیاں لیتی رہی اور پو پھٹنے کے انتظار میں تڑپتی رہی۔

صبح کے اُجالے میں جب بستی کے لوگ رمضان چچا کی لاش قبرستان میں دفن کرنے کے بعد واپس اپنے اپنے گھر کی طرف لوٹنے لگے تو ایک انجانی آواز نے ان قدم روک دئے۔

''عقل کے اندھو کہاں بھاگے جا رہے ہو؟ کب تک خود کو دھوکہ دیتے رہو گے؟ اگر اسی طرح آنکھیں بند کر کے اپنی تقدیر کو کوستے رہو گے تو وہ کالے پیڑ تم سبھوں کو ایک ایک کر کے ختم کر ڈالیں گے۔ ذرا ہوش میں آجاؤ' اپنی آنے والی نسل کے بارے میں سوچو!!!''

سب لوگوں نے جب مڑ کر دیکھا تو صدیوں پرانے بلند قامت چنار کے گھنے سائے میں ایک بارعب نورانی چہرے والے خدا رسیدہ بزرگ کو باوقار اور پرسکون حالت میں پایا۔ تمام لوگ اس کے سامنے باادب کھڑے ہو گئے۔ بھیڑ میں سے ایک

شخص نے جرأت کر کے بزرگ سے پوچھا۔

''حضرت! ہم لوگوں نے آپ کو پہچانا نہیں۔''

یہ سنتے ہی بزرگ غضبناک آواز میں بول پڑا۔

''ارے نادانو! تمہاری آنکھوں پر غفلت کا پردہ پڑا ہے۔ میں تمہارا ماضی ہوں......وہ شاندار ماضی، جس پر زمانے کو ہمیشہ ناز رہا۔ میں تمہاری تواریخ ہوں۔ وہ عظیم الشان تواریخ، جس کی مثال آج تک دنیا پیش کرنے سے قاصر ہے۔''

بزرگ کے یہ پُرمغز الفاظ سُن کر تمام لوگوں کے سر شرم سے جھک گئے۔ لوگوں نے جب بزرگ کو اپنی داستان الم سُنا کر اسے نجات حاصل کرنے کے لئے دُعا کی درخواست کی تو بزرگ نے جلال میں آ کر انھیں پھٹکارا۔

''یہ مصیبت تمہاری جرمِ ضعیفی کی سزا ہے۔ یہ تمہارے بُرے اعمال کا بدلہ ہے۔ تم ان کالے پیڑوں کے رکھوالوں کے سر پر اپنے ہاتھوں سے حاکمیت کا تاج رکھتے ہو۔ اپنے اسلاف کے اصولوں کے برعکس ان دوست نما دشمن حاکموں کے اصولوں کی آبیاری کرتے ہو۔ دماغ تمہارا اور سوچ ان کی۔ تم لوگ اپنے ایمان سے آنکھیں چُرا کر، اپنے ضمیر کو کچل کر ان کے ہاتھوں پر بیعت کرتے ہو اور انھیں برسوں تک مسند اقتدار پر بٹھاتے ہو۔ اگر تمہیں ان کالے پیڑوں کے شعلوں سے خود کو بچانا ہے تو ان کی ہیبت سے نکل کر اپنی راکھ میں چنگاریاں تلاش کرو۔ کیونکہ یہی چنگاریاں دھکتے شعلے بن کر ان کالے پیڑوں کے جنگل کو راکھ کا ڈھیر بنا سکتی ہیں۔''

خزاں کا موسم تھا۔ بستی کے گردونواح کی پہاڑیوں کے اندر کا لاوا پھٹ پڑا اور سرد فضا، فضائے آتشین بن گئی۔ صدیوں پرانے چنار کے سُرخ مائل پتوں کو اپنے وجود کا احساس ہونے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پرسکون چنار، آتشِ چنار کا منظر پیش کرنے لگا

اورکالے پیڑوں کا جنگل شعلوں کی بارش سے جل اٹھا۔

..................☆☆☆..................

کالے دیوؤں کا سایہ

(دوسرا مجموعہ)

انتساب

جنت نظیر کی ان کلیوں

کے نام

جن کے گلابی بدن کالے دیوؤں کے آہنی

پنجوں سے ریزہ ریزہ ہو گئے

چھوڑ دو

کالے ناگ نے پھن مارتے مارتے اُس کی یاداشت کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ چھوڑا ہے۔ ماضی کی دردناک یادوں کا بوجھ ڈھوتے ڈھوتے وہ جب اپنے اپاہج وجود کو بستر پر ڈال دیتا ہےتو رات کے سیاہ سایوں کے درمیان دیواروں پر اُبھرتی ڈوبتی پُر ملال صورتوں کی نمناک آنکھوں کے ٹپکتے شبنمی قطروں سے وہ لرز اُٹھتا ہے۔ وہ نا چاہتے ہوئے بھی جب اپنی آنکھیں بند کر کے اپنے لرزتے وجود کو سفید لحاف کے اندر چھپانے کی کوشش کرتا ہےتو دیوار کی اُبھرتی ڈوبتی صورتوں کا خوفناک منظر اُس کے دل ودماغ میں ایسا طوفان برپا کر دیتا ہے کہ اُس کا اپاہج جسم زلزلے کے شدید جھٹکوں سے ہلنا شروع ہو جاتا ہےاوراُس کے کانپتے ہونٹوں اور کڑکڑاتے دانتوں سے ایک ہی آواز اندھیرے کی چیرتی رہتی ہے......اُسے چھوڑ دو......!

چھوڑ دو......!!!

جبار چاچا کا ناتواں جسم ستر کے پڑاؤ پر کھڑا ہے۔ کبھی اُس کا بھی ایک خوشحال خاندان تھا۔ اُس کی زندگی کا اثاثہ اُس کے کھیت کھلیاں تھے جن کی دیکھ ریکھ اُس کا

پیشہ تھا۔نذیر خان اُس کا اکلوتا بیٹا تھا اور شریفہ اُس کی اکلوتی بیٹی۔جبار چاچا کی تمنا تھی کہ اُس کے بچے پڑھ لکھ کر باعزت زندگی گزار سکیں۔اُس نے دونوں کی اچھی پرورش کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔نذیر خان گریجویشن کے آخری سال میں تھا اور شریفہ گریجویشن کے پہلے سال میں۔گاؤں کے لوگ جبار چاچا کے نام اور کام پر یہ سوچ کر رشک کرتے رہتے کہ اَن پڑھ ہونے کے باوجود بس نے اپنے بچوں کو تعلیم کے نور سے منور کرنے میں بڑے پاپڑ بیلے ہیں۔اُس کے دونوں بچے بھی باپ کی محنت ومشقت کا خیال رکھتے ہوئے پڑھائی کی طرف بڑا دھیان دیتے رہتے،نہیں تو گاؤں کے دوسرے بچوں کی طرح ان کی تان بھی میٹرک تک ہی ٹوٹ جاتی۔دن ڈھلنے کے ساتھ ساتھ جبار چاچا جب گھر میں آجاتا تو دونوں بچے اُس کے سامنے بیٹھ جاتے اور کالج کے دن بھر کے پروگراموں کا تذکرہ چھیڑ دیتے ۔جبار چاچا ان کی باتیں سُن کر خوش ہوجاتا اور کہتا رہتا کہ میرا خواب ہے کہ جب تم دونوں پڑھ لکھ کر ماسٹر بن جاؤ گے تو میرا سر فخر سے اونچا ہوجائے گا۔نذیر خان باپ کی باتیں سن کر مذاقاً کہتا کہ بابا اَن پڑھ ہونے کی وجہ سے تمہاری سوچ بھی چھوٹی ہے۔مجھے سول سروسز کا امتحان پاس کر کے بڑا افسر بننا ہے اور مُنی کو لیکچرار بننا ہے۔جبار چاچا بیٹے کی باتیں سُن کر زبان سے کہتا کہ مجھے افسری اور لیکچرری کے بارے میں کچھ معلوم نہیں لیکن دل ہی دل میں خدا تعالیٰ سے دُعا کرتا رہتا کہ

اُس کے بچوں کی مراد پوری ہو جائے۔

گاؤں کے اوپر ظالموں کا خوف طاری تھا۔ظالموں کی وحشت ناک حرکتوں سے بستی کے لوگ تنگ آ چکے تھے۔روز روز کے دل دوز واقعات و سانحات سے لوگوں کی زبانیں گنگ ہو چکی تھیں۔خوف کا سائرن فضا میں لگا تار بجتا رہتا۔اس پُر گھٹن ماحول میں جبار چاچا کے بچوں کا تعلیم جاری رکھنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ایک دن شریفہ کالج سے گھر لوٹ رہی تھی کہ اچانک ظالموں کی ایک تیز رفتار گاڑی نے بستی کے ایک پھول جیسے بچے کو سڑک کنارے کچل ڈالا۔بستی کے لوگوں نے احتجاج کرتے ہوئے نزدیکی پولیس اسٹیشن میں کیس دائر کر دیا۔

پولیس نے مشتعل لوگوں کے دباؤ میں آ کر کیس عدالت میں پیش کیا اور شریفہ بحیثیت عینی گواہ عدالت میں حاضر ہوئی۔کچھ عرصہ کے بعد جب قاتلوں کو عدالت میں حاضر ہونے کا حکم ملا تو وہ کیس کو دبانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگانے لگے۔وہ شریفہ کو اپنے راستے کا سب سے بڑا کانٹا سمجھ کر دھمکانے لگے کہ وہ عدالت میں اُن کے خلاف گواہی دینے سے باز رہے۔شریفہ کے انکار نے ظالموں کے غرور کو للکارا اور وہ اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کی سبیل سوچنے لگے۔

نذیر خان گریجویشن کے آخری ایام میں ہی سِول سروسز کے امتحان کی تیاری کرنے لگا۔اسی دوران گھر والوں نے اُس کا رشتہ ایک نزدیکی رشتہ دار کے ہاں

طے کیا۔شادی کی تیاری بڑے زور شور سے ہونے لگی۔شادی کے دن سارے گاؤں میں جشن کا ماحول تھا۔دلہن کو پُر مسرت ماحول میں گھر لایا گیا۔تمام مہمان رخصت ہوئے۔نذیر خان کی ماں بار بار دلہن کے سر پر ہاتھ پھیرتی رہی اور جبار چاچا بڑے سکون سے حُقے کے کش لیتے لیتے سوچتا رہا کہ اُس کی زندگی کا پہلا خواب پورا ہو گیا۔آدھی رات تک جب تمام لوگ اُدھر اِدھر کی باتیں کرتے کرتے تھک گئے تو جبار چاچا نے شریفہ کو بستر بچھانے کے لئے کہا۔شریفہ ابھی بستر بچھانے کی تیاری ہی کر رہی تھی کہ اچانک دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔گھر والے ابھی دروازہ کھولنے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ آٹھ دس ہتھیار بند نقاب پوش بدمست ہاتھیوں کی طرح، شریفہ کہاں ہے؟ شریفہ کہاں ہے؟ چلاتے ہوئے کمرے میں گھُس گئے۔چند ہی منٹوں کے اندر ایک دیوقد ظالم شریفہ کو اپنے کندھوں پر اُٹھا کر گھر سے باہر لے گیا۔شریفہ دردناک آواز میں بھیا مجھے بچاؤ...... بابا مجھے بچاؤ چلاتی رہی۔جبار چاچا اپنی معصوم بیٹی کو بچانے کے لئے ظالموں کے پیر پکڑ کر گڑ گڑاتے ہوئے اُن سے اپنی بیٹی کی زندگی کی بھیک مانگنے لگا لیکن ان سنگ دلوں نے بندوق کے ایک ہی وار سے اُس کی گردن توڑ ڈالی۔وہ زخمی کبوتر کی طرح پھڑ پھڑاتے ہوئے بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔ظالموں کی یہ درندگی دیکھ کر نذیر خان کا خون کھول اُٹھا اور وہ ہاتھ میں ڈنڈا لے کر ظالموں کے

پیچھے دوڑ پڑا۔ اُس کی نئی نویلی دلہن بھی عروسی لباس میں ہی اس کے پیچھے پیچھے روتی بلکتی دوڑ پڑی۔ ظلم کی اندھی تلوار اندھیرے میں چمک اُٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے عدم تشدد کے بوسیدہ کھنڈر سے جمہوریت کے کھوکھلے ایوان بھڑک اُٹھے۔ جلتے ایوانوں کے بھڑکتے شعلوں نے مظلوموں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا ڈالا۔ کالے بادلوں کی کڑکتی بجلی نے روشن ستاروں کو بھسم کر ڈالا۔

برسوں سے وہ ایک زندہ لاش بن کر بے بسی کے عالم میں زندگی کی جنگ لڑ رہا ہے۔ اُس کے کان بچوں کی میٹھی میٹھی باتیں سننے کے لئے ترس رہے ہیں۔ رات کے اندھیرے میں جب وہ اپنے اپاہج جسم کو بستر کے اوپر ڈالنے کی کوشش کرتا ہے تو کمرے کی دیواروں سے نذیر اور شریفہ کی اُبھرتی ڈوبتی صورتیں نمودار ہو جاتی ہیں۔ وہ آنکھیں بند کر کے اپنے منہ کو سفید لحاف میں چھپانے کی کوشش کرتا ہے لیکن اُس کے کانوں سے بیٹی کی دردناک آواز ٹکراتی ہے...... بابا...... مجھے بچاؤ...... بابا...... مجھے بچاؤ۔ وہ لحاف کے اندر منہ چھُپائے بے خودی کے عالم میں بڑبڑاتا رہتا ہے۔ اُسے چھوڑ دو...... چھوڑ دو......!!!

☆☆☆

ہائی جیک

سیاہ بادلوں کی کڑکتی بجلیوں نے پُرسکون سمندر کی خاموش لہروں کو سونامی کا روپ دھارنے پر مجبور کر دیا ہے۔اس کا جزیرہ نما دل بھڑکتے شعلوں کا خندق بن چکا ہے اور برستی آگ کی سلسلہ وار پھٹوں نے اس کے دماغ میں غم اور خوشی کے تصور کو جلا کر راکھ کر دیا ہے۔اس کی غمگین آنکھیں، سنہرے اُجالے کی تلاش میں، کالی رات کے قیامت خیز اندھیرے کو کاٹتے کاٹتے تھک چکی ہیں۔خوف زدہ دماغ کے مایوس خیالات اسے اشارہ کر رہے ہیں کہ شاید سنہرے اُجالے کے چمکتے آفتاب کی روشن کرنوں کو کالے بادلوں نے قید کر رکھا ہے۔اس کا ارتعاش شدہ جزیرہ غم ناک سونامی کی خوش آشام لہروں کی آماجگاہ بن چکا ہے۔یہ خون آشام لہریں شاہینی سوچ رکھنے والے انسانوں کو ہی اپنا شکار بنا رہی ہیں۔ان کی اندھی یلغار کا ایک ہی مقصد ہے کہ ہر شاہین کی پرواز آمنا وصدقنا تک محدود رہے۔پرواز کی ہر آزادی پر قدغن لگائی جائے اور ان کی پسند سب کی پسند......!!!

اُس کا پریشان دماغ سوچنے کی صلاحیت کے باوجود بھی صحیح سوچ نہیں سکتا کیونکہ

اندھیرے نے اس کی سوچ کو ہائی جیک کر رکھا ہے۔ مذہب کا پرستار ہونے کے باوجود بھی وہ مذہب کو اپنا نہیں سکتا۔ مذہب کو اب صرف سیاست کے قالب میں بند کیا گیا ہے۔ مذہب کی تعلیم اُسے بتا رہی ہے کہ ہر انسان کو پہلے انسان کی طرح سمجھو اور انسانیت کو ترجیح دو لیکن وہ مذہبی تعلیم پر کیسے عمل کر سکتا ہے کیونکہ اس کی سوچ تو ''ہائی جیک'' ہو چکی ہے جو اُسے بتا رہی ہے کہ یہاں تو انسان نے اپنی سوچ کا مذہب بنا رکھا ہے۔ یہاں تو ہر قوم اپنی بالادستی قائم رکھنے کے لئے مذہب کا استحصال کر رہی ہے۔ مذہب' انسان کو اپنی فکر بخشتا ہے لیکن یہاں تو انسان اپنی سوچ کو مذہبی فکر کا لبادہ پہنا رہا ہے اور مذہبی فکر کو اپنی سوچ کی زمین میں ڈال کر نئے نئے نظریات کے پودے اُگا رہا ہے۔کوئی قدامت پرستی کا اسیر اور کوئی جدیدیت کا یرغمال......انتہا پسندی صرف انتہا پسندی......!!!

دن بھر کی مصروفیات سے تھک ہار کر وہ رات کی تنہائی میں سچ اور جھوٹ کی جنگ کا نظارہ کرنا چاہتا ہے۔ نیوز چینل کا نمبر ریموٹ پر دباتے ہی اسکرین پر فلیش نیوز آتی ہے:

''ڈرون کے حملے میں اسکول تباہ' درجنوں معصوم بچے موت کی آغوش میں۔''

''یہ دہشت گردی ہے' حیوانیت کے شکار معصوم بچوں کے والدین کا احتجاج۔''

''نہیں ایسے اقدام دنیا میں امن بحال کرنے کے لئے ضروری ہیں۔''

سفیر امن کا بیان۔
''ایک خوفناک دھماکے میں نیٹو کے درجن بھر فوجی ہلاک۔''
یہ دہشت گردی ہے'' سفیر امن کا بیان''جمہوریت کے دشمنوں سے ضرور بدلہ لیا جائے گا۔''
اس کی سوچ ان خون آشام مناظر کو دیکھتے دیکھتے یہ سمجھنے سے قاصر نظر آ رہی ہے کہ اصلی دہشت گرد کون ہے......؟''
وہ ہسٹری چینل کا بٹن دباتا ہے. وہاں پر بھی اسے صرف آگ کے گولے ہی نظر آتے ہیں۔ وہ سوچتا ہے:
''انسان نے لالچ کو اپنا دیوتا بنالیا ہے اور اس کی حیوانیت کے سیاہ کارنامے لکھتے لکھتے انسانیت کی تاریخ اب بوڑھی ہو چکی ہے وہ اب صحیح اور غلط کو پہچاننے سے بے زار نظر آ رہی ہے۔''
مرنے اور مارنے والوں کے فلسفۂ امن کے پروپگنڈہ نے اُس کے ذہن میں انتشار کا طوفان برپا کر رکھا ہے۔ وہ انسان کی چینل سے مایوس ہو کر اب حیوانوں کی چینل کا بٹن دباتا ہے۔ اینمل چینل پر افریقہ کے وہ گھنے جنگل دکھائے جا رہے ہیں جن میں غیر مہذب جنگلی جانور کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ ایک خوبصورت جھیل کے کنارے سینکڑوں ہرن پُر امن ماحول میں پانی پی رہے ہیں۔

جھاڑیوں کے پیچھے خون خوار شیر حملے کی تاک میں بیٹھے ہیں۔طاقت کے نشے میں مست یہ خونخوار درندے اچانک ہرنوں پر جھپٹ پڑتے ہیں' ہرنوں کے جھنڈ پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔بہت سارے ہرن درندوں کے شکار بن جاتے ہیں ۔زخمی ہرن خوف کے مارے جھیل میں کودتے رہے۔جھیل کے پُرسکون پانی میں ارتعاش کی لہریں اُٹھنے لگتی ہیں اور نیلا پانی سرخ مائل ہوتا گیا۔

معصوم ہرنوں کے خون سے درندوں کا پیٹ بھر جاتا ہے اور اُن کے خون آلودہ منہ فتح کی دھاڑ سے گرجنے لگتے ہیں۔ان درندوں کی گرجدار آواز سارے جنگل میں خوف پھیلانے لگی کہ یہاں ہمیشہ طاقت کی بادشاہت رہے گی۔یہ خوفناک نظارہ دیکھتے دیکھتے اُس کی سوچ میں اُبال آیا۔اُسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس کی سوچ ہائی جیکر کے شکنجے سے آزاد ہو رہی ہے اور اس کی زبان سے بے ساختہ نکل پڑا......

حیوان کون......؟



ہارٹ اٹیک

سرما کا موسم تھا۔ زبردست برفباری ہورہی تھی۔ شام کے پانچ بج چکے تھے اور شہر سے دیہات کی طرف جانے والی یہ آخری ٹیکسی تھی۔ سیٹ پر بیٹھتے ہی اُسے وہاں پچاس برس کا ایک موٹا تازہ شخص کالے رنگ کا ایمپورٹڈ اُوَرکوٹ پہنے نظر آیا۔ اُس نے اپنے دستانے نکال کر اپنے ہینڈ بیگ میں رکھ دیے۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹاٹ کی اور وہ فوجی بنکروں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی تیز رفتاری سے آگے بڑھنے لگی۔ اُسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ اُورکوٹ والا شخص اُسے دیکھ کر کچھ گھبرا سا رہا ہے اور وہ کَن انکھیوں سے اُس کی طرف بار بار دیکھ رہا ہے۔ اُس کے لمبے لمبے بال اور گھنی داڑھی کا حُلیہ اُوَرکوٹ والے شخص کے خوف کو بڑھاوا دے رہا تھا۔ اجنبی سواری کی بے قراری کو بھانپنے کے باوجود بھی وہ خاموش رہا لیکن جب ڈرائیور نے اُوَرکوٹ والے شخص سے خیر و عافیت پوچھی تو وہ اُس کا نام سُن کر چونک گیا اور اُس پر ایک بھرپور نظر ڈالی۔ اُورکوٹ والا شخص ڈرائیور سے سہمی سہمی آواز میں بات کر رہا تھا۔ ایسا محسوس ہورہا تھا کہ جیسے اُس کا ذہن کسی بڑی نفسیاتی الجھن میں

پھنسا ہوا ہے اور اُس کے الفاظ ٹوٹ رہے ہیں۔ بات کرتے کرتے اُس کے چہرے سے سخت سردی کے باوجود پسینہ چھوٹ رہا تھا۔ گاڑی منزل کی جانب دوڑ رہی تھی اور اندھیرا ابھی بڑھ رہا تھا۔ وہ سکوت کا عالم توڑتے ہوئے اُسے پوچھنے لگا کہ'' آپ شاید وہی سیف الوقت تو نہیں ہیں جسے امن بحال کرنے کے عوض '' سرکار کی طرف سے 'ایوارڈ'' ملنے والا ہے۔'' ہاں...... ہاں'' وہ جلدی میں بول پڑا۔'' لیکن میں نے آپ کو نہیں پہچانا۔''

'' میرا نام محتسب ہے'' وہ بڑے اطمینان کے ساتھ بول پڑا۔'' ہم دونوں ایک ہی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں اور آپ کے نام اور کام کے بارے میں' میں سب کچھ جانتا ہوں۔''

'' سب کچھ جانتے ہو'' وہ گھبراہٹ سے پوچھنے لگا۔'' لیکن...... کیوں...... کیسے ......؟''

وہ اُس کی بدلتی ہوئی حالت کا حیرانی سے جائزہ لینے لگا۔'' آپ کیوں پریشان سے نظر آرہے ہو؟'' محتسب نے سوال کیا۔

'' نہیں...... نہیں'' یہ کہتے ہوئے وہ رومال سے چہرے کو صاف کرنے لگا'' کوئی خاص بات نہیں ہے۔''

'' جی...... میں ایک اسکالر ہوں'' محتسب نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا

''میرے مقالے کاعنوان ہے''گمشدہ نسل''

''گمشدہ نسل'' وہ اُسے گھورتے ہوئے بولا''بڑا عجیب سا موضوع ہے۔''

''عجیب سا موضوع''محتسب تشویش آمیز لہجے میں پوچھ بیٹھا''آپ کو یہ عجیب موضوع لگ رہا ہے۔''

''نو،سوری'' وہ سر ہلاتے ہوئے بولا''بس یونہی منہ سے نکل گیا۔''

محتسب اُس کی اندرونی حالت کو بھانپ گیا۔اُسے محسوس ہوا کہ اس شخص کے ذہن پرانجانہ خوف طاری ہےاور وہ اس کی ہر بات کوشک کی نظر سے دیکھ رہا ہے۔اُسے یقین نہیں ہورہا ہے کہ وہ واقعی ریسرچ اسکالر ہے یا کوئی......؟

محتسب نے اُس کو اپنی حالت پر چھوڑا اور آنکھیں بند کرکے اُس کے شب وروز پر غور کرنے لگا۔

محتسب یونیورسٹی میں ریسرچ کررہا تھا۔وہ وادی کی اُس گمشدہ نسل پر تحقیق کررہا تھا جو پچھلی دو دہائیوں سے لا پتہ ہو چکی تھی۔وادی کے قبرستانوں میں سینکڑوں بے نام لاشیں دفن تھیں اور ان لاشوں کے سوداگر مختلف ایجنسیوں سے اپنا اپنا خراج وصول کرتے آئے تھے۔گمشدہ نسل کے وارثوں نے حقوق انسانی کے عالمی ایوانوں تک اپنی بات پہنچائی تھی اور اپنے غائب شدہ بچوں کی واپسی کے لئے احتجاجی راستہ اپنایا تھا لیکن جہاں عقابوں کے نشیمن پر زاغوں کا قبضہ ہو وہاں

انصاف کی توقع رکھنا پتھر سے پھول نکالنے جیسا عمل ہوتا ہے۔سیاست کے پجاری اپنی اپنی سیاسی دکانیں چمکانے کے لئے انصاف کے طالب ان وارثین کے احتجاجوں کا من پسند استحصال کرتے آئے تھے۔سیف الوقت بھی ان ہی سوداگروں میں سے ایک تھا جنہوں نے دولت اور شہرت کمانے کے لئے سینکڑوں انسانوں کی زندگیوں کا خاتمہ کر ڈالا تھا۔سیف الوقت یعنی وقت کی تلوار؛اس کا اصلی نام نہیں تھا بلکہ یہ نام اس نے ان دنوں اپنایا تھا جب وہ ایک تحریک کا حصہ بن گیا تھا۔دوسرے کئی لوگوں کے ساتھ وہ اس تحریک کو چلانے کے لئے رات دن کام کرتا رہتا۔علاقے کے لوگ اُس کی ہر بات پر یقین کی مہر ثبت کرتے تھے۔وہ دس سالوں کے بعد شہر سے گاؤں کی طرف آ رہا تھا۔ان دس برسوں میں بستی کو کن کن آفتوں کا سامنا کرنا پڑا وہ اس سے لاتعلق رہا۔وہ بستی جو کبھی خوشیوں کا گہوارہ ہوا کرتی تھی اب گورستان کا نمونہ بن گئی تھی۔ہر گھر میں ماتم کی شمعیں جلتی تھیں۔اس گلستان جیسی بستی کو گورستان بنانے کا ذمہ دار یہی سیف الوقت تھا۔برسوں پہلے اس شخص نے ایک آواز بلند کی تھی جو بستی کے لوگوں کے لئے ایک نئی آواز تھی۔بستی کا ہر فرد اُس کی آواز پر لبیک کرتا گیا۔وہ ہر گلی،ہر کوچے میں اسٹیج سجاتا رہا اور بستی کے نوجوانوں کو اپنے مشن میں شامل کرتا گیا۔وہ انہیں آزادی کے سنہرے خواب دکھاتا رہا اور نوجوان اس خواب کو پورا کرنے کے لئے اپنی جان خطروں

میں ڈالتے گئے۔ کئی برسوں تک بستی نوجوانوں سے خالی ہوتی چلی گئی۔ ہر انسان بندوق کی بولی بولنے لگا اور ہر کان گولیوں کی آواز پسند کرنے لگا۔ انسانی لاشوں سے نئے نئے قبرستان آباد ہوتے گئے۔ اس شخص کا حکم کسی بھی انسان کے لئے موت اور زندگی کا حکم ہوتا تھا۔ برسوں تک یہ خون آشام سلسلہ چلتا رہا اور نوجوان مشنِ آزادی کی خاطر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے رہے۔ بستیاں کھنڈرات بنتی گئیں اور چمنستان ویران ہوتے گئے۔

ایک دن سیف الوقت اچانک غائب ہوگیا۔ اس کی جگہ دوسرے لوگوں نے سنبھالی۔ مشن چلتا رہا۔ بستی سے جوانوں کا صفایا ہوتا رہا۔ رفتہ رفتہ بندوق کا خوف دم توڑنے لگا لیکن رات کے اندھیرے میں گھروں سے نوجوان غائب ہونے شروع ہوگئے۔ ہر انسان خوف زدہ تھا، ہر زبان گنگ تھی۔ کسی کو بھی پتہ نہیں چلتا تھا کہ رات کے سیاہ سائے میں ان نوجوانوں کو کون سے ہاتھ اُٹھا کر غائب کررہے ہیں۔ کئی برسوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ مشن آزادی کے میر کارواں نے مشن امن کی علَم بلند کی تھی۔ وہ مشن آزادی کی ایجنسی سے ناطہ توڑ کر مشنِ امن کی ایجنسی کا حامی بن گیا تھا۔ وہ شہر میں مشنِ امن کا دفتر چلا رہا تھا اور کئی بڑے بڑے محلوں کا مالک بن گیا تھا۔

ٹیکسی دو گھنٹے سے لگاتار چل رہی تھی۔ گاؤں پہنچنے تک ابھی گھنٹہ بھر فاصلہ تھا۔

محتسب نے آنکھیں کھولیں اور سیف الوقت کی طرف دیکھنے لگا۔ سیف الوقت کے چہرے پر ابھی بھی خوف چھایا ہوا تھا۔ محتسب نے سوچا کہ اُس کی تحقیق کے حوالے سے سیف الوقت سے کافی مواد مل سکتا ہے۔

''آپ پہلے مشنِ آزادی کے علمبردار تھے'' محتسب نے پہلا سوال کیا ''اور اب مشنِ امن کا دفتر چلا رہے ہیں۔''

''جی ہاں'' سیف الوقت نے اثبات میں جواب دیا ''میں وادی میں پھر سے امن بحال کرنا چاہتا ہوں۔''

''لیکن جن لوگوں نے آپ کی آواز پر اپنی زندگیاں داؤ پر لگا دیں'' محتسب ایک اور سوال پوچھ بیٹھا ''ان کی قربانیاں آپ کس مشن میں ڈالتے ہیں، مشنِ آزادی یا مشنِ امن......؟''

''دیکھئے جناب'' سیف الوقت نے تھرتھراتی آواز میں کہا ''میرا مشن اب نوجوانوں کو واپس قومی دائرے میں لانا ہے۔''

''اچھا...... یہ جو سرکار کی طرف سے آپ کو ایوارڈ ملنے والا ہے'' محتسب نے ایک درد انگیز سوال پوچھا ''ضمیر کی آواز پر مجھے بتائے کہ آپ اس کے حق دار ہیں کہ نہیں؟''

یہ سوال سنتے ہی سیف الوقت کے ذہن پر کوڑے برسنے لگے۔ بلڈ پریشر بڑھنے

کی وجہ سے اُس کے چہرے پر سُرخی پھیلنے لگی اور دانت زور زور سے بجنے لگے۔ دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔اُس کا سارا وجود لرزنے لگا۔اُس نے اپنا ہاتھ ادل پر رکھا اور آخری ہچکی لیتے ہوئے اُس کے منہ سے نکل پڑا۔''ہارٹ اٹیک''



زندگی کا بازار

وہ صبح سویرے کسی دانا شاعر کا یہ دردناک مصرعہ ''زندگی کی سب دکانیں بند ہیں اس شہر میں'' بلند آواز سے گاتا ہوا پاس والی گلی سے گزرتا رہتا۔ اس کا درد بھرا آہنگ اس قصبہ نما کالونی کے ہر گمشدہ دل کے ساتھ ساتھ میرے منتشر ذہن پر بھی درد بھرا تیشہ چلا کر جاتا۔ کچی عمر میں جب بھی اس کی دردناک آواز میری کچی نیند پر بیداری کا ہتھوڑا چلاتی تو میری ناگوار طبیعت دل ہی دل میں اس کو کوستی رہتی اور میری زبان سے بے ساختہ نکل پڑتا۔

''یہ کس نے پھونک دیا صور وقت سے پہلے
اُٹھا ہوں آنکھوں میں اِک خوابِ نا تمام لئے''

اُسے وقت کی پابندی کا پورا احساس تھا۔ وہ وقت کی اہمیت سے بے خبر انسانوں کی اس بستی میں جب قدم رکھتا تو گلی گلی کوچہ کوچہ آواز لگاتے لگاتے گزر جاتا۔ گٹھری کے بار سے اُس کی کمر ہمیشہ جُھکی سی رہتی تھی۔ وہ کسی بھی گلی کے نکڑ پر

تھوڑی دیر تک منتظر گاہکوں کا انتظار کرتا اور جب گاہک آجاتے تو وہ اپنی گٹھری کا بند منہ کھول دیتا اور بڑی مسرت کے ساتھ ضرورت مند گاہکوں کی حاجت پوری کر دیتا۔ گاہک بھی اپنی من پسند چیزیں خریدنے کے بعد بھی کافی دیر تک اس کے اردگرد دائرے کی صورت میں کھڑے رہتے اور اس کی روح افزا اور دانشمندانہ باتیں سنتے سنتے روحانی طور پُرسکون محسوس کرتے رہتے۔ لوگوں کی مادی اور روحانی حاجت روائی کے بعد وہ گٹھری کا منہ بند کر کے دوسری گلی کی طرف قدم بڑھاتا اور اس کا یہ سفر طلوع آفتاب سے لیکر غروب آفتاب تک روز جاری رہتا۔ میں اکثر محسوس کرتا تھا کہ لوگ بڑے شوق سے اُس کی باتیں دہراتے رہتے ہیں اور اُس کی دانائی کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے ہیں۔ غم اور خوشی کی محفلوں میں اُس کا ذکر ضرور رہتا۔ بزرگوں کا کہنا تھا کہ وہ کسی دور دراز دیہات کا رہنے والا ہے اور کئی دہائیوں سے لگاتار پو پھٹتے ہی اس بستی میں قدم رکھتے آیا ہے اور روزی روٹی کمانے کے ساتھ ساتھ وہ بستی کے سُکھ دُکھ میں بھی بغیر کسی لالچ کے شرکت کرتا رہتا ہے۔ میں نے کبھی بھی کسی کی زبان سے اُس کے متعلق کوئی ناخوشگوار بات نہیں سنی۔ ہر ایک کی زبان پر اُس کی تعریف ہی ہوتی تھی۔ حدِ بلوغ تک پہنچتے پہنچتے میرے دل میں اُس کی آواز اُترتی گئی اور جس صبح اُس کی مانوس آواز میرے کانوں سے نہیں ٹکراجاتی تو میں حسبِ عادت وقت پر جاگ جاتا اور

نیند بھری آنکھوں سے کھڑکی کھول کر پاس والی سنسان گلی کو دیر تک جھانکتا رہتا۔ اُس کو غیر حاضر پا کر مجھے محسوس ہوتا تھا کہ ساری کالونی پر مایوسی کا عالم چھایا ہوا ہے اور چناروں پر بیٹھے پرندے بھی اپنی اپنی جونچ بغل میں چھپائے مایوس نظر آ رہے ہیں۔ میں جب اس مایوس کن ماحول کا جائزہ لینے کی کوشش کرتا تو میں یہ سمجھنے سے قاصر رہ جاتا کہ یہ بے زبان پرندے کیوں مایوس دکھائی دیتے ہیں شاید وہ بھی میری طرح مانوس آواز نہ سُن کر مایوسی کا اظہار کر رہے ہیں۔ انسان سوچ کی بنیاد پر کسی آواز سے خوشی یا غم کا اثر لیتا ہے لیکن یہ پرندے......خیر میں اپنی منتشر سوچ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کھڑکی بند کر دیتا اور کام پر نکلنے کی تیاری میں لگ جاتا لیکن بے قراری کا عالم دن بھر میرے وجود پر چھایا رہتا۔

آہستہ آہستہ اُس کی آواز دوسرے لوگوں کی طرح میری سوچ پر بھی اثر انداز ہوتی گئی اور میں اُس کی صدائے جرس سنتے ہی بستر سے اُٹھتا اور صبح سویرے اس کی مجلس میں چلا جاتا۔ وہ نُکڑ پر کھڑے پرانے گھنے چنار کے سائے تلے اپنی دکان لگاتا رہتا۔ بچے، جوان، بوڑھے اور مرد و زن اس کے اردگرد جمع رہتے۔ اس کی گٹھری میں بچوں سے لیکر بڑھوں تک کا چھوٹا موٹا گھریلو سامان دستیاب ہوتا تھا۔ بچے جب اُس کی چیزوں کو اُلٹ پلٹ کرتے رہتے تو ناراض ہونے کے بجائے وہ انہیں ہنستے مسکراتے وہاں سے بھگانے کی کوشش کرتا رہتا اور جب کوئی

معصوم بچہ اُسے پوچھے بغیر یا پیسہ دئے بغیر کوئی چیز اُٹھا کر کھا جاتا تو وہ اُس کو بھی نہیں ڈانٹتا تھا۔ بچے اکثر اُسے پوچھتے رہتے کہ پھیری والے چچا! ''کیا تمہارے گاؤں میں سیب کے باغ ہوتے ہیں؟'' وہ تھیلے سے سیب نکال کر انہیں بڑے پیار سے دیتے ہوئے کہتا رہتا ''ہاں! ہمارے گاؤں میں بڑے بڑے سیب کے باغ ہیں۔''

اُس کی گٹھری میں جتنی بھی چیزیں ہوتی تھیں وہ سب بیچتا رہتا ایک سفید کپڑے کے سوا، باقی رنگ کے کپڑے تو وہ فروخت کرتا لیکن وہ سفید کپڑا کسی کو بھی نہیں دیتا تھا۔ ایک مرتبہ جب کسی نے اُسے وہ سفید کپڑا بیچنے کے بارے میں کہا تو وہ تیز لہجے میں بول پڑا کہ:

''زندگی کی مصنوعی چہل پہل نے آپ لوگوں کی سوچ سے موت کا تصور چھین لیا ہے...... یہ میرا کفن ہے نہ جانے کب اور کہاں اس کی ضرورت پڑے گی۔'' میں اس کی حقیقت پسندانہ سوچ پر حیران رہ گیا۔

اتوار کے دن وہ کافی دیر تک چنار کے سائے تلے بیٹھتا رہتا اور لوگ بھی فرصت کے لمحات کا فائدہ اُٹھا کر اُس کے اردگرد جمع رہتے اور ذہنی سکون سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتے رہتے۔ ایک دن بھری محفل میں کسی نوجوان نے اُسے پوچھا:

''چچا! آپ کے گاؤں میں جدید سہولیات کی کون کون سی چیزیں دستیاب ہیں۔'' نوجوان کا سوال سُن کر اُس نے ہر طرف نظر گھمائی۔ سامنے عالیشان محل نما مکانات کا ایک گھنا جنگل دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اے سی رومز، کمپیوٹرس، کیبل کنکشنز، نئے ماڈلز کی نئی نئی گاڑیاں، اولڈ ایج ہاوس، چائلڈ کیر سنٹرس وغیرہ جیسی جدید سہولیات سے کالونی بھری پڑی تھی۔ ان تمام خارجی سہولیات کے باجود کالونی کی داخلی زندگی سکون سے خالی نظر آ رہی تھی۔ دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد جب کوئی انسان رات کو سونے کے لئے بستر پر لیٹ جاتا تو وہ صرف اپنی آنکھیں بند کر سکتا تھا۔ دماغ کو راحت دینے کے لئے اُسے نیند کی گولیوں کو سہارا لینا پڑتا۔ ہر شخص کے خیالات کی نازک کشتی ٹینشن کے گہرے سمندر میں ڈوبتی ہی چلی جاتی تھی۔ مادی چیزوں کو پانے کی دوڑ میں انسان کی فطرت حیوانی خصلت میں بدل گئی تھی۔ جس کی وجہ سے انسانیت پر حیوانیت کا زور بڑھتا جا رہا تھا۔ کالونی کے قبرستان میں ایک بڑا پولیس اسٹیشن موجود تھا جو زندوں کو مُردوں کی ہڈیاں چبانے سے کبھی کبھی باز رکھتا تھا۔ رات کے گہرے سائے پڑتے ہی زندگی کا بازار بند ہو جاتا۔ اور ہر انسان پریشان حالی کے بھنور میں پھنس جاتا۔ کچھ دیر کالونی کی پر اسرار زندگی کے اتار چڑھاؤ پر سوچنے کے بعد وہ بڑی سنجیدگی سے نوجوان کے سوال کا جواب دینے لگا:

''بیٹا! ہمارے گاؤں میں سب کچھ قدیم ہے۔صاف وشفاف چشمے اُبلتے ہیں، تازہ ہوا چلتی ہے، بغیر ملاوٹ کھانے کی چیزیں ملتی ہیں۔لوگ اپنے ہاتھوں سے زراعت کماتے ہیں۔تازہ پھل کھاتے ہیں۔ ہری ہری سبزیاں اُگتی ہیں۔لوگ محنت کرتے ہیں، صحت مند ہوتے ہیں۔اور سب سے اہم چیز یہ ہے کہ وہاں انسان......انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔لوگوں کے دلوں میں محبت کے سمندر موجزن ہیں اور ہونٹوں پر فطری مسکراہٹ کے پھول کھلتے ہیں۔وہاں کے ماحول میں امن وسکون کی خوشبودار مہک چھائی رہتی ہے۔''

ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔نوجوان حیرت انگیز آنکھوں سے پھیری والے کی طرف دیکھ رہے تھے۔عورتیں آبدیدہ نگاہوں سے مردوں کے چہروں کو پڑھ رہی تھیں اور مرد مایوس بھری نظروں سے بستی نُما جنگل کا مشاہدہ کر رہے تھے۔میں رات کا کھانا کھانے کے بعد جب بستر پر نیند کی تلاش کے لئے لیٹ گیا تو نیند کے بدلے دانا پھیری والے کے دانشمندانہ خیالات اور خلوص بھرے جذبات میرے ذہن پر چھائے رہے اور میں اپنے گردونواح میں چھائے ہوئے مصنوعی ماحول کی زہرناک فضاؤں سے رہائی پانے کے بارے میں سپیدہ سحری تک سوچتا رہا۔نیند کا خمار جب میرے دماغ پر چڑھنے لگا تو اونگھتے اونگھتے میری آنکھ لگ گئی۔اچانک میرے کانوں کے ساتھ پھیری والے کی دردناک آواز ٹکرائی کہ''زندگی کی سب

دکانیں بند ہیں اس شہر میں۔'' میں نیند کے گہرے سمندر سے نکل کر زندگی کی کشتی کا مسافر بن گیا۔سورج کی چمکتی کرنیں جب میری خواب گاہ میں داخل ہو گئیں تو میں نیند بھری آنکھوں سے کھڑکی کھول کر سنسان گلی میں اُس آواز کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا لیکن گمشدہ آواز کا کہیں بھی پتہ نہ چل سکا۔تمام کالونی پر تشویشناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔کالونی کی کہر زدہ فضاؤں میں چیل کوئے لمبی لمبی اُڑان بھرنے میں مگن تھے۔گھنے چنار کے ہرے پتوں پر خزاں کا سایہ پڑ چکا تھا اور بستی کا سیاہ دھواں یہ اشارہ کر رہا تھا کہ شاید اب بستی کی فضاؤں میں کسی پھیری والے کی دردناک آواز کبھی نہیں گونجے گی......کبھی نہیں......کبھی نہیں......!!!

کالے دیوؤں کا سایہ

غروب آفتاب کے ساتھ ہی کالے دیوؤں کا خوفناک سایہ بستی کی خاموش فضا پر آندھی بن کر چھا جاتا اور شل زدہ ذہنوں میں ماتم کی دھنیں بجنا شروع ہو جاتیں۔ خوف کا سائرن بجتے ہی خون آلودہ دلوں کی دہشت ناک لہروں سے غمگین سوچوں میں وحشت ناک ارتعاش پیدا ہو جاتا۔ معصوم بچے رات بھر ماں کی چھاتی سے لپٹ جاتے اور والدین ساری رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹنے پر مجبور ہو جاتے۔

برفیلے پہاڑوں کے دامن میں بستی کے بیچوں بیچ کالے دیوؤں کی ویران گھاٹی کے پھاٹک کے سامنے برفیلے گالوں کے درمیان مرے ہوئے کتوں کا عفونت انگیز ڈھیر راہ چل رہے لوگوں پر وحشت طاری کر رہا تھا۔ خون میں لت پت یہ کتے اپنی عادت نہ چھوڑنے پر اپنی جان کھو بیٹھے تھے۔ رات کے اندھیرے میں جب کالے دیو بستی میں گھسنے کی کوشش کرتے تو ان کے ناپاک عزائم کو بھانپتے ہی ان بے زبانوں کا احتجاج شروع ہو جاتا۔ ان بے زبانوں کا احتجاج جب کالے دیوؤں کی

ناکامی کا سبب بنتا گیا تو انہوں نے ان کتوں کو بستی والوں کے وفادار محافظ سمجھ کر انہیں ہلاک کرنے کا آپریشن شروع کر دیا اور اس بے زبان مخلوق کی نسل کشی کا سلسلہ شروع ہوا۔

کالے دیوؤں کا یہ منحوس سایہ کئی دہائیوں سے بستی کے اوپر چھایا ہوا تھا اس جنت نُما بستی کے روح پرور مشک بار ماحول کو ان بدصورت کالے دیوؤں کی بدبودار سانسوں نے پلیگ زدہ بنائے رکھا تھا اور ان خبیث روحوں کی جابرانہ موجودگی کی وجہ سے بستی کے عنبر آگیں چمن زاروں، چھَر چھَر کرتے آبشاروں، پُر فریب کہساروں اور حُسن خیز سبزہ زاروں پر منحوسیت کے سیاہ سائے چھائے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں یہ چنڈال فطرت بدصورت مخلوق کن بدتہذیب ویرانوں سے نکل کر ہاتھی کے دانت دکھائے بستی کے ریشم مزاج انسانوں کے سروں پر موت بن کر سوار ہو چکی تھی۔ چمنستان کے باغیرت باغبان لگاتار ان بے غیرت حملہ آوروں کو بھگانے کے وظائف پڑھتے رہتے تھے پر بستی کا نصیب ہی جانے کہ یہ بدفطرت مخلوق وظائف کے اثر کو بے اثر بنانے کے لئے بستی کے ہی چند کالے بھیڑوں کی ناپاک نفسیات کو اپنے آسیبی حربوں سے متاثر کر جاتے اور وہ کم ظرف شعبدہ باز اپنے کرتبوں سے ان کی موجودگی کو دوام بخشنے کی راہیں ہموار کرنے میں اپنے کرتب دکھاتے رہتے۔

یہ بدفطرت کالے دیو بستی کے کسی بھی گھر میں بے دھڑک گھس جاتے اور اپنی خون خوار آنکھوں کا رعب جماتے ہوئے بستی کے مکینوں کی بے بسی اور بے کسی کے ساتھ جس طرح سے چاہتے کھلی اڑاتے رہتے۔ اگر کوئی انسان اپنی آن بچانے کے لئے ان درندوں سے اُلجھ پڑتا تو ان وحشیوں کے خونخوار پنجے اس مظلوم کو نوچ نوچ کر لہولہان کر جاتے اور ان کے معصوموں کو پلک جھپکتے ہی جھپٹ کر لے جاتے۔ بستی کے لوگ ان آدم خوروں کے بجائے ان بے زبان کتوں کی وفاداری اور انسان دوستی کے شکر گزار نظر آتے تھے۔ جو رات کے گھنے سائے میں اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر بستی کے لوگوں کو بھونکتے بھونکتے ان ظالموں کی آمد کا اشارہ کرتے رہتے۔

پھاٹک کے سامنے مارے گئے کتوں کی بدبو سے جب کالے دیو تنگ آ گئے تو انہوں نے بستی کے لوگوں کو حکم جابری سنایا کہ وہ ان خون آلودہ کتوں کو اپنے اپنے کاندھوں پر اُٹھا کر دور کسی نالے میں پھینک دیں۔ بے بس لوگ حکم جابری کی تعمیل کرتے ہوئے کتوں کو کاندھوں پر اُٹھائے جا رہے تھے کہ اچانک انہیں مردہ کتوں کے ڈھیر میں ایک خوبصورت نوجوان کی لاش پر نظر پڑی۔ وہ خوف زدہ ہو کر ڈھیر سے پیچھے ہٹنے لگے۔ انہیں پیچھے ہٹتے ہی کالے دیو آگ بگولہ ہو کر چلانے لگے:

''سالے......! پیچھے کیوں ہٹے......؟ ان کتوں کو جلدی جلدی یہاں سے ہٹاؤ، ہوا میں بدبو پھیل رہی ہے۔''

''ان......ان میں ایک انسانی لاش بھی ہے۔'' ایک نوجوان لرزتی آواز میں بول پڑا۔

''اُس کو بھی یہاں سے دفع کرو اور ان کتوں کے ساتھ کسی نالے میں ڈال دو'' کالی غار سے ایک طنز آمیز آواز آئی۔

''لیکن......!''

''سوال مت کرو، نہیں تو تو بھی کُتے کی موت مرے گا....سالا'' ایک اور خوفناک آواز نوجوان کے کانوں سے ٹکرائی۔

کالے دیو ''جشن زیتون'' منانے کا پروگرام بنا چکے تھے۔ بستی کے بچوں کو ہدایت ملی تھی کہ وہ رنگارنگ پروگرام بنانے کے ساتھ ساتھ ''شاخ زیتون'' کے موضوع پر بھی تقریر تیار کریں۔ دوسرے نوجوانوں کے ساتھ ساتھ معصوم الوقت نے بھی پروگرام میں شرکت کرنے کا ارادہ کرلیا اور ''شاخ زیتون'' کے فلسفے پر روشنی ڈالتے ہوئے تمام سامعین سے دادِ تحسین پائی۔ کالے دیوؤں کا رہبر بھی معصوم الوقت کے امن پسند خیالات سے خوش ہوا اور وہ اپنے امن کے مہان دیوتا کے بنائے ہوئے خوشنما سفید رنگ کبوتر، جس کی چونچ میں ''شاخ زیتون'' رکھی ہوئی تھی، معصوم

الوقت کو انعام میں دیتے ہوئے جشن شاستری پڑھنے لگا:

''ہمیں بے حد خوشی ہو رہی ہے کہ بستی کے نوجوانوں میں امن کی روح جاگ اُٹھی ہے۔ اُن کی آنکھیں روشنی کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ میں آپ لوگوں سے وعدہ کرتا ہوں کہ بستی کے اندر اب کسی قسم کا کالا سایہ نظر نہیں آئے گا۔ آپ لوگ صرف اپنی بستی میں زیتون کے پیڑ اُگانے کا وعدہ کیجئے۔''

''جشنِ زیتون'' ختم ہوتے ہی معصوم الوقت خوشنما سفید رنگ کبوتر کو لے کر گھر کی جانب دوڑ پڑا۔ وہ گھر والوں کو اپنے انعام کی خوشخبری سنانے کے لئے بے قرار ہو رہا تھا۔ وہ جونہی کالے دیوؤں کی پھاٹک کے قریب پہنچا تو اُسے رکنے کی آواز سنائی دی۔ چند منٹوں کے بعد اُسے دوسرے لوگوں کے ساتھ مردہ کُتے اُٹھانے کا حکم ملا۔ اُس کے انکار کرنے پر کالے دیوؤں کی آنکھوں میں خون پھیلنے لگا۔ اُس کے ہاتھ میں اپنے دیوتا کے خوش نما سفید رنگ کبوتر کو دیکھتے ہی ایک دیو پوچھ بیٹھا:

''یہ کبوتر تم کو کہاں سے ملا؟''

''جشنِ زیتون والے پروگرام میں شاخِ زیتون سے متعلق میری تقریر سے خوش ہو کر آپ کے رہبر نے مجھے یہ کبوتر انعام میں دے دیا۔'' معصوم الوقت نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''ہمیں شاخِ زیتون کا فلسفہ سکھاتا ہے'' یہ کہتے ہوئے کالے دیوؤں نے اُسے

مردہ کتوں کے ڈھیر پر پھینک دیا۔

''نہیں......! یہ سراسر ظلم ہے۔ تمہاری اس وحشت ناک حرکت سے مہان دیوتا کے امن پسند آدیشوں کا خون ہو رہا ہے۔ آپ صفائی کرم چاریوں کی مدد سے ان کتوں کو یہاں سے ہٹا سکتے ہیں۔'' معصوم الوقت کے منہ سے شاخ نبات کے میٹھے میٹھے الفاظ نکل رہے تھے۔

''ہمیں شانتی کا منتر سکھا رہا ہے۔ سالا'' ایک بدصورت دیو اُس پر اپنے خونخوار پنجوں سے وار کرتے ہوئے بول پڑا۔

معصوم الوقت کے جسم سے خون کے فوارے نکل پڑے۔ چند ہی لمحوں کے اندر اندر شاخِ نبات کی مٹھاس اُس کی شریانوں میں زہر بن کر دوڑنے لگی۔ اور مہان دیوتا کے سفید کبوتر پھڑ پھڑانے سے جھیل کا نیلا پانی سرخ مائل ہوتا گیا۔ کالے بادلوں کی خوفناک بجلیاں چار سو گرجنے لگیں۔ بے بس مخلوق بدحواسی کے عالم میں خون آلودہ کتوں کے ساتھ ساتھ معصوم الوقت کی خون ٹپکتی لاش کو بھی اپنے ناتواں کندھوں پر اُٹھائے جا رہے تھے اور کالی آندھی ان کے شل زدہ کانوں کو کالے دیوؤں کے سرہنگ کا قومی پیغام سُنا رہی تھی:

''اگر جنت کے وارثین، اپنے بچوں کے ہاتھوں میں شاخِ زیتون تھما دینگے تو انہیں شاخ نبات سے نوازا جائیگا۔''

خوف

اُس کے وجود پر خوف کا بھیانک سایہ چھایا ہوا تھا۔ کپکپی طاری ہوتے ہی وہ لاشعوری کے عالم میں تھرتھراتے ہاتھ سے اپنا گال تھام لیتا۔ اُس کی نفسیات پر اس خوف ناک زہریلے جنگلی سانپ کی دہشت اثر انداز ہوچکی تھی۔ خوف نے اُس کی سوچ پر ایک حُلیہ نقش کیا تھا اور جب بھی اس حُلیہ کی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرا جاتی تو خوف کا یہ زہریلا جنگلی سانپ اُس کے انگ انگ کو ڈھسنا شروع کر دیتا۔

کلاس روم میں ایک مرتبہ ٹیچر نے پانچویں جماعت کے طلاب سے کہا کہ حروف تہجی کے مطابق ہر طالب علم بورڈ پر حرف کے ساتھ تصویر بھی بنائے تو اُس نے حرف ''خ'' سے ''خوف'' لکھا اور سامنے ایک حُلیہ بنا ڈالا۔ ماسٹر جی یہ دیکھ کر ہنس پڑے اور اُسے سمجھاتے ہوئے بولے:۔

''بیٹا تم نے ''خ'' کے سامنے پولیس والے کی تصویر بنائی وہاں پر ''ح'' حفاظت کرنے والا لکھو' کیونکہ پولیس والا قانون کا محافظ ہوتا ہے۔ وہ ہماری حفاظت کرتا

ہے۔ پولیس کے بغیر سارا امن وامان بگڑ جائے گا اور ہر جگہ قاتلوں اور ڈاکوؤں کا خوف پھیلے گا۔''

خوف کے زہریلے جنگلی سانپ نے اُس کے وجود کو ڈھنسنا شروع کر دیا۔ تھرتھراتا ہاتھ اُس کے گال کی طرف بڑھنے لگا اور وہ ''حفاظت''، نہیں، ''حفاظت''، نہیں، ''خوف''، خوف چلاتا ہوا کلاس روم سے بھاگ گیا۔ ماسٹر جی اُس کی یہ عجیب حالت دیکھ کر حیران ہوا۔

خوف کے اس زہریلے سانپ نے اُس کے ذہن پر اُس وقت پھن مارا تھا جب کالی رات کے گہرے سایوں کے درمیان بے لگام بندوق کی شعلے برساتی گولیوں نے اس کے والد کی روح کے ساتھ ساتھ قانون کی روح کو بھی ختم کر ڈالا تھا اور اس معصوم نے کالا نقاب اوڑھے بندق بردار کی ٹانگ دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر روتے روتے پوچھا تھا کہ تم نے میرے ابو جان کو کیوں گولی ماری۔ جواب میں نقاب پوش نے غصے میں آ کر اُس کی گال پر ایک ایسا زوردار تھپڑ مارا تھا کہ اُس کے دانت ہل اٹھے تھے۔

سہیل کا والد محمد انور ایک حق پرست اور خوددار انسان تھا۔ ایک میڈیکل ڈاکٹر کی حیثیت سے وہ اپنے مریضوں کو جسمانی علاج کے ساتھ ساتھ ایمان داری، حق پرستی اور خودداری کے روحانی علاج سے بھی نوازتا رہتا۔ حکیم الامّت علامہ اقبالؔ کا

درجہ ذیل شعر ہمیشہ اُس کی زبان پر ہوتا تھا۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رُوباہی

بستی کے لوگ ڈاکٹر محمد انور کی بڑی قدر کیا کرتے تھے اور اُس کی ایمان داری او رخودداری کی مثال دیا کرتے رہتے۔ایک دن پولیس حراست کے دوران بستی کے ایک معصوم نوجوان کی موت واقع ہوگئی۔ پولیس نے لاش کو سرکاری اسپتال میں پوسٹ مارٹم کے لئے داخل کرایا۔ڈاکٹر محمد انور نے پوسٹ مارٹم رپورٹ میں لکھا کہ مذکورہ نوجوان کی موت حراستی ٹارچر کے ذریعے ہوئی ہے۔لوگوں کے احتجاجی مظاہروں کی وجہ سے مسئلہ زور پکڑتا رہا۔ جب اوپر سے پولیس پر دباؤ بڑھ گیا تو انہوں نے ڈاکٹر انور کو پوسٹ مارٹم رپورٹ بدلنے پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ کئی دنوں تک جب پولیس کا دھونس دباؤ ڈاکٹر محمد انور کی ایمان داری اور خودداری کے سامنے دم توڑ بیٹھا تو قانون کے محافظ آخر کار اپنے کالے کرتوت چھپانے کے لئے رات کے اندھیرے میں اُس کے گھر میں گُھس گئے۔انہوں نے جب تلاشی کے بہانے گھر کی چھوٹی چھوٹی قیمتی چیزیں اپنے اپنے پاکٹوں میں بھرنا شروع کیں تو ڈاکٹر محمد انور نے ڈاکوؤں جیسی اس حرکت پر احتجاج کرنا شروع کیا۔ بندوق کے دہانے شعلے برسانے لگے اور دوسروں کی جان بچانے والا ڈاکٹر خود اپنی

جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ ہیڈ کوارٹر کو میسج دی گئی کہ ملی ٹنٹوں اور پولیس کے درمیان انکاونٹر کے دوران ڈاکٹر محمد انور مارا گیا۔
سہیل جب بڑا ہوا تو خوف کا یہ زہریلا جنگلی سانپ نفرت کا خوفناک اجگر بن چکا تھا۔ گریجویشن کرنے کے بعد پولیس کی ایک خصوصی بھرتی مہم میں سہیل بھی وائر لیس آپریٹر سلیکٹ ہو گیا۔ ٹریننگ مکمل کرنے کے ساتھ ہی اُسے ایس، ایس پی کے ہمراہ وائرلیس آپریٹر کی حیثیت سے رکھا گیا۔ وہ اپنا فرض بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ نبھاتا رہا۔ اس کی شخصیت اگرچہ خودداری کے جوہر سے آراستہ تھی تاہم خوف کے زہریلے جنگلی سانپ نے اس کی سادہ فطرت کو زہر آلودہ بنا کے رکھ چھوڑا تھا۔ مظلوم والد نے اُسے ایک ایماندار ڈاکٹر بنانے کا خواب دیکھا تھا لیکن خوف کے کالے ہاتھوں نے انسانیت کا قتل کرتے ہوئے سہیل کے بہتر مستقبل کو بھی قتل کر ڈالا تھا۔ وہ سوچتا رہتا کہ قانون اصل میں اندھا نہیں ہوتا ہے بلکہ روشن قانون کے کالے پاسبانوں کے کالے کرتوت ہی اُسے اندھے قانون کا درجہ دلواتے ہیں اور اُن کے فریب شدہ دعوے ہی ایک تعمیری ذہن کو تخریبی سوچ میں بدل دیتے ہیں۔ سہیل کے ذہن پر کالے پاسبانوں کا سیاہ سایہ اس طرح سے چھایا ہوا تھا کہ اس کی سوچ میں پولیس اور خوف ہم شکل وجود بن گئے تھے۔
خوشگوار فضائیں بدامنی کے منحوس بادلوں کی زد پر تھیں۔ پُرامن ذہن خوف کے

گرداب میں پھنسے ہوئے تھے۔ ہر نئے حادثے کے ساتھ ساتھ سیاسی کرگس میڈیا کے ذریعے لوگوں کو امن وامان قائم رکھنے کی روایتی اپلیں کرتے اور حادثہ کے ذمہ دار افراد کو سزا دلوانے کے سیاسی وعدے کرتے رہتے۔ عام شہری سیاسی کرگسوں کے ان کھوکھلے وعدوں کی اصلیت جان چکے تھے اور وہ ان وعدوں کو کسی ناکام کمپنی کے پروڈکٹ ایڈورٹائیزینگ سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ایس۔ ایس۔ پی کو شہر میں امن وامان بحال کرنے کے سلسلے میں قومی ایوارڈ سے نوازنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ نفرت کے خوفناک اجگر نے دھیرے دھیرے رینگنا شروع کر دیا۔ ایس ایس پی صبح سویرے سرکاری ایوارڈ پانے کے لئے فیملی سمت گیٹ پر کھڑی اپنی شاندار گاڑی میں سوار ہوا۔ گاڑی اسٹاٹ ہوتے ہی ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ سہیل کا ایک ہاتھ تھرتھراتے ہوئے اُس کے گال کی طرف بڑھنے لگا اور دوسرے ہاتھ سے وہ وائرلیس پر پولیس کنڑول روم کو میسج دینے لگا:

''ملی ٹنٹوں کے ایک خوفناک دھماکے میں ایس ایس پی صاحب فیملی سمیت شہید ہو گئے۔''

گمشدہ قبرستان

غروب آفتاب کے ساتھ ہی اُس کی نظریں مشرقی پہاڑی والے درّے پر جم جاتی تھیں۔ کالی رات کے سیاہ سائے پھیلنے کے ساتھ ساتھ اُس کی نظروں کے سامنے مایوسی کا غبار چھا جاتا اور وہ کھڑکی بند کر کے فریم میں مقید مسکراتے فوٹو کو اپنے سینے سے لگا کر زار وقطار رونا شروع کر دیتی۔ جدائی کے کربناک لمحوں کے درمیان ' رات کے سناٹے میں پہاڑی درّے سے صرف ایک ہی دردناک آواز اُس کے کانوں سے ٹکراتی رہتی......میں واپس آونگا......میں واپس آونگا......!!!

واپس آنے والی یہ پُر اُمید آواز اب نا اُمیدی کا صحرا بن کر سلطانہ کی روح میں سراب بن کر اُتر چکی تھی کیونکہ لمحوں نے اب برسوں کا روپ دھار لیا تھا۔ وہ بیوہ کے خوفناک لفظ سے ایسے ڈرتی تھی جیسے کوئی تندرست انسان زہریلے سانپ کے ڈسنے سے ادھ مرا پڑا ہو۔ اُس کے زخمی دل کا مرہم صرف ماں کی ایک دُعا تھی...... سدا سہاگن رہو بیٹی......لیکن جب جدائی کے غمگین جذبات کی تیز وتند لہریں دل سے اُٹھ کر اس کی سوچ پر اثر انداز ہو جاتیں تو اعتماد کے پہاڑ میں وشواس کا آتش

فشاں گرم ہو جاتا اور وہ اُمید کے بھنور میں پھنس کر سوچتی کہ وہ بیوہ ہیں یا کہ سہاگن ......؟

سلطانہ کا مسکن سلطان پور تھا۔ سلطان پور، وادی کا ایک خوب صورت گاؤں تھا۔ فلک بوس پہاڑوں کے درمیاں واقع یہ گاؤں ایک تابناک تاریخ کا حصّہ رہا تھا۔ اس کی اپنی ایک شاندار تہذیب تھی، اپنا ایک شاندار تمدن تھا۔ زندگی کی سانسیں خوشگوار ماحول میں چلتی تھیں۔ گاؤں کے لوگ خوشبودار فضاؤں کے آزاد پنچھی معلوم ہوتے تھے، لیکن ان آزاد پنچھیوں کی آزادی اس وقت چھن گئی جب خوشبودار فضاؤں پر سیاہ بادلوں کی کڑکتی بجلیوں نے آگ کے شُعلے برسانا شروع کر دیئے۔ ہر طرف کالا دھواں پھیل گیا اور گھر گھر سے ماتم کی دھنیں بجنے لگیں۔ برسوں پہلے سلطان پور کے بلند پہاڑوں سے کالی بلاؤں کا ظہور ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان خوفناک بلاؤں نے طاقت کے بل پر سلطان پور کو اپنے خونین شکنجے میں اس طرح سے کس لیا کہ ہنستے مسکراتے چہرے مرجھے مرجھے سے نظر آنے لگے۔ دہشت کی وجہ سے ہر انسان نفسیاتی مریض بنتا گیا اور گلستان قبرستان بنتے گئے۔

گاؤں کے اسی پُر آشوب ماحول میں سلطانہ جوان ہو گئی۔ رشتے آنے لگے، مشورے ہوتے رہے اور آخر کار سلطانہ کا رشتہ گاؤں کے ایک ایسے خوب رو بہادر نو جوان سے طے ہوا جو نام کا ہی نہیں بلکہ دل کا بھی سلطان تھا۔ بہادر

ہونے کے ساتھ ساتھ صالح فطرت بھی تھا اور ہر کسی کی مدد کرنے میں پیش پیش رہتا تھا۔ ایک دفعہ جب گاؤں کے ایک غریب کسان کی گائے مرگئی تو غریب کسان کے گھر سے آہیں اور سسکیاں اُٹھنے لگیں۔ سلطان سے غریب کا یہ صدمہ برداشت نہ ہوا اور اُس نے گھر کی گائے بلا معاوضہ غریب کسان کو دے دی۔ کُشتی میں اُسے کوئی بھی پچھاڑ نہیں سکتا تھا اور کبڈی کے کھیل کا تو وہ چمپئن ہی تھا۔ کھیتی باڑی اُس کا پیشہ تھا۔ وہ سال بھر اپنے ہی کھیت کھلیانوں میں محنت مزدوری کر کے روزی روٹی کماتا تھا۔ گاؤں کی اکثریت بھی زراعت کے پیشے سے ہی وابستہ تھی۔ پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد اگرچہ کم تھی تاہم گاؤں کے اکثر بچے اب اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔

ایک صبح تمام گاؤں والوں کو کڑکتی سردی میں گھروں سے باہر نکالا گیا اور ایک بڑے میدان میں یخ بستہ برف کے اوپر بٹھایا گیا۔ چار جانب ہتھیار بند پھیلے ہوئے تھے۔ خوف و دہشت کی بلاؤں نے ہاہا کار مچاتے ہوئے نوجوانوں کو چن چن کر اپنی گرفت میں لینا شروع کر دیا۔ ان کے کپڑے اُتار اُتار کر انہیں ننگے بدن پیڑوں سے باندھا گیا۔ ٹارچر شروع ہوگیا۔ چیخ و پکار سے پیڑوں پر بیٹھے پرندے بھی سہم گئے۔ سلطان کو بھی پیڑ پر اُلٹا لٹکایا گیا اور درجن بھر بندوق بردار اُس پر ٹوٹ پڑے۔ گاؤں کے بے گناہ نوجوانوں کو بے رحمی سے مارتے مارتے

دیکھ کر گاؤں والے شور مچانے لگے۔ جرأت کا مظاہرہ کر کے سلطانہ اندھی بندوق کے سامنے کھڑی ہوگئی اور ظالموں کے ہاتھوں سے سلطان کو چھڑوانے کی کوشش کرنے لگی۔ کمانڈر نے رُعب دار آواز میں اسے پیچھے ہٹنے کو کہا۔

''آپ لوگ بندوق کا رعب جما کر انہیں کیوں ظلم کا نشانہ بنا رہے ہو۔'' سلطانہ احتجاج کرتے ہوئے بول پڑی۔

''ہمیں اطلاع ملی ہے کہ گاؤں کے نوجوان دہشت گردوں کا ساتھ دے رہے ہیں۔''

''دہشت گرد......کون......؟'' سلطانہ کا پارا چڑھنے لگا ''جنہوں نے طاقت کے بل بوتے پر گھسیٹ کر ہمیں یہاں لایا۔''

''ہمارے کام میں دخل مت دو۔'' کمانڈر نے گالی دیتے ہوئے اُسے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی۔

سلطانہ نے بھی جذبات میں آکر اُس کے منہ پر کرارا تھپڑ مارا۔ لوگ بھی زوردار احتجاج کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے اور بندوق بردار گرم ماحول دیکھ کر وہاں سے فرار ہو گئے۔

شادی کا دن تھا۔ سلطانہ کو بڑے دھوم دھام سے سُسرال لایا گیا۔ نصف رات کے وقت اچانک دروازے پر دستک ہوئی اور آناً فاناً نقاب پوش افراد کی ایک ٹولی

گھر کے اندر گُھس گئی۔ سلطان کے ساتھ ساتھ دوسرے افرادِ خانہ کو بھی بندوق کی نوک پر گھر سے باہر نکالا گیا۔ سلطانہ کو کمرے میں ہی بند کیا گیا۔ سلطان کے ہاتھ رسیوں سے باندھے گئے۔ ہر طرف خوف کے سائے منڈلانے لگے۔ سیاہ بادلوں کی کڑکتی بجلی نے پھولوں کی سیج کو بھسم کر ڈالا۔ جمہوریت کے ایوان ہلنے لگے۔ وحشی کی جھپٹ سے مظلوم ہرن کی دردانگیز چیخ اندھیرے میں گونج اُٹھی۔ سلطان ظالموں کے شکنجے کو توڑ کر کمرے کی طرف دوڑ پڑا۔ سلطانہ بستر پر بے حس پڑی تھی۔ سلطان نے درندے کے ہاتھ سے بندوق چھینی اور گردن پکڑ کر اُسے گھسیٹتے ہوئے مکان سے باہر لایا۔ نقاب پوش سلطان پر ٹوٹ پڑے اور اسے زنجیروں میں جکڑ کر پہاڑی کے اور چل پڑے۔ سلطانہ ٹوٹے قدموں سے کھڑکی پر کھڑی ہوگئی۔ اندھیرے کی وجہ سے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پہاڑی درّے سے صرف ایک آواز آرہی تھی، سلطانہ میں واپس آؤنگا......میں واپس آؤنگا۔

گزرتے وقت کے کرب انگیز لمحوں نے سلطانہ کے دل و دماغ کو شل کر کے رکھ دیا تھا۔ امید کے ہرے بھرے پتے زرد ہوتے جارہے تھے۔ عید کا چاند نکل آیا تھا۔ خوشی کے ان لمحات میں بھی سلطانہ کی سوچ پر مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ رات کا کھانا کھانے کے ساتھ ہی وہ بستر پر لیٹ گئی۔ آنکھ لگتے ہی اُسے خواب میں سطان نظر آیا جو باہیں پھیلا پھیلا کر کہہ رہا تھا:

''سطانہ کل مجھ سے ملنے آنا... ہم پھر سے ملیں گے۔اب ہمیں کوئی ظالم جُدا نہیں کرسکتا۔''

سلطانہ کی نیند اچانک ٹوٹ گئی۔وہ کھڑکی کھول کر پہاڑ کی طرف دیکھنے لگی۔وہاں صرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔وہ مایوس ہوکر دوبارہ بستر پر لیٹ گئی۔اس نے آنکھیں تو بند کر لی لیکن نیند کوسوں دور بھاگ چکی تھی۔صبح تک اس کی آنکھوں میں عجیب وغریب مناظر آتے رہے۔عید کی گہما گہمی چارسو پھیلی ہوئی تھی۔سلطانہ کے قدم نا چاہتے ہوئے بھی قبرستان کی جانب بڑھنے لگے۔قبرستان پچھلی دودہائیوں سے سینکڑوں مظلوموں کو اپنی گود میں سُلاتا آیا تھا۔قبرستان میں پہنچ کر سلطانہ کو ایک سبز رنگ کا کتبہ نظر آیا۔کتبے پر''گمشدہ قبرستان'' لکھا ہوا تھا۔یہاں کشمیر کی گمشدہ نسل دفن تھی۔گمشدہ قبرستان ایسی ہزاروں گمنام قبروں کا مسکن تھا جس میں عدمِ تشدد کا فلسفہ جمہوریت کا کفن اوڑھے ہوئے دفن تھا۔قبرستان مظلوموں کی آہوں اور سسکیوں سے ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔کوئی ماں اپنے گمشدہ بیٹے کو ڈھونڈ رہی تھی اور کوئی معصوم بچہ اپنے گمشدہ باپ کی قبر تلاش کر رہا تھا' لیکن کسی کے ہاتھ مایوسی کے سوا کچھ بھی نہ آتا تھا۔چارسو حشر کا سماں بپا تھا۔اس حشر نما عالم میں سلطانہ کے ٹوٹے قدم ایک گمنام قبر کے نزدیک خود بہ خود رُک گئے۔وہ قبر کو غور سے دیکھنے لگی۔اُسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ قبر اسے کہہ رہی ہے کہ سلطانہ تیرا سلطان

میری گود میں سو رہا ہے۔ظالموں نے اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے میرے حوالے کر دیا تھا۔سلطانہ لرزتے وجود کے ساتھ وہاں سے چیختی چلاتی گھر کی جانب دوڑ پڑی ’نہیں ایسا نہیں ہوسکتا......ایسا نہیں ہوسکتا......! کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس نے سلطان کا فوٹو سینے سے لگایا اور خون کے آنسوں بہانے لگیں۔

رات کے سیاہ سائے دن کے اُجالے پر چھا جانے لگے۔ہتھیاروں سے لیس درجن بھر نقاب پوش گھر کے اندر نمودار ہو گئے۔گھر کے اندر سناٹا چھا گیا۔خوف کے مارے سلطانہ کا دل بیٹھنے لگا۔

’’تم نے ہمارے خلاف کیوں ہیومن رائٹس کمیشن میں کیس دائر کر دیا ہے؟‘‘ کالا افسر دانت دکھاتے ہوئے پوچھ بیٹھا۔

’’کہاں ہے میرا سلطان؟‘‘ سلطانہ سہمی سہمی آواز میں بول پڑی ’’مجھے میرا سلطان لوٹا دو۔‘‘

’’وہ دہشت گردوں کے ساتھ کام کرتا ہے۔‘‘ وہ پھنکارتے ہوئے بول پڑا۔’’تم اس کاغذ پر انگوٹھا لگاؤ۔‘‘

’’مجھے میرا سلطان واپس لا کر دو۔‘‘ سلطانہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار نکل پڑی ’’تو ہی میں سفید کاغذ پر انگوٹھا مارونگی۔‘‘

ظلم کی ننگی تلوار ہوا میں رقص کرنے لگی۔سلطانہ کے دل سے خون کا فوارہ پھوٹ

پڑا۔سرخ خون سے سفید کاغذ پر انگوٹھا لگ گیا۔جدائی کی آخری سانسیں دم توڑ نے لگیں۔ہوا کے ایک تیز جھونکے سے کھڑکی کے پٹ کُھل گئے۔سلطان پور کے گھر گھر سے ماتم کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔کالی بلاؤں کے خونین پنجوں نے گلستان کے رنگ برنگے پھولوں کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ چھوڑا اور سلطانہ کی آس بھری نظریں پہاڑی کے اُس درّے پر جم چکی تھیں جہاں بھیانک اندھیرا تھا......

صرف بھیانک اندھیرا!



زہریلے ناخدا

اُس کی جوانی......زندگی اور موت کی آخری کشمکش میں مبتلا تھی۔اسپتال میں خود کو پا کر اُسے یک گونہ سکون محسوس ہوا لیکن جسم میں پھیل رہے زہر کو وہ کیسے روک پاتی۔وہ حادثات اُس کے ذہن میں گردش کرنے لگے جن کی وجہ سے آج وہ زندگی کی آخری سانسیں لے رہی تھیں۔وہ ایک غریب دیہاتی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔باپ کی محنت مزدوری سے گھر کا چولہا گرم رہتا تھا۔اس کے باپ نے اپنی زندگی کی ساٹھ بہاریں دیکھی تھیں، جوخزاں سے بھی بدتر تھیں۔وہ ایک دور افتادہ گاؤں کا باشندہ تھا جو شہر سے تقریباً دوسو میل کی دوری پر واقع تھا۔اُس دیہات میں جدید زمانے کی جدید سہولیات تو کیا زندگی کی بنیادی ضروریات بھی میسر نہ تھیں۔نہ بجلی کا کوئی انتظام اور نہ ہی طبی سہولیات! گاؤں میں کوئی اسکول نہ ہونے کی وجہ سے بستی کے بچے طلوع آفتاب کے ساتھ ہی دور کے ایک سرکاری اسکول میں پڑھائی کے لئے پیدل جاتے تھے اور غروب آفتاب کے ساتھ ساتھ

اپنے اپنے گھروں میں واپس لوٹ آتے۔ الیکشن کے فریبی موسم میں بہت سارے سیاسی گدھ ان پسماندہ دیہات میں نمودار ہوتے تھے اور ان لوگوں کے مشکلات کو دور کرنے کے وعدے کرتے رہتے لیکن الیکشن جیتنے کے بعد وہ صرف اپنے مشکلات کو ہی حل کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ اس اندھیرے میں بھی اکبر خان نے خون پسینہ ایک کرکے اپنے لڑکے جاوید کو گریجویشن تک پڑھایا اور اپنی بیٹی حسینہ کو بھی گریجویشن کرنے کے لئے شہر کے ایک کالج میں ایڈمیشن کروایا تھا۔

جب جاوید سرکاری محکمہ میں بحیثیت کلرک ملازم ہوا تو اکبر خان نے راحت کی سانس لی۔ کچھ مہینے بڑے سکون سے گزر گئے کہ اچانک ایک دن اکبر خان کے گھر والوں کو یہ منحوس خبر ملی کہ جاوید دفتر سے لوٹتے وقت شہر میں ہوئے ایک بم دھماکے کی زد میں آکر اپنی جان کھو بیٹھا۔ اکبر خان کے گھر کے ساتھ ساتھ سارے گاؤں میں صف ماتم بچھ گئی۔ اکبر خان کی نئی بہار کو خزاں نے دبوچ لیا۔

دھماکے میں مارے گئے معصوم شہریوں کے حق میں سرکار کی طرف سے ایک لاکھ روپے کے ساتھ ساتھ گھر کے ایک فرد کو سرکاری نوکری دینے کا بھی اعلان ہوا۔ وقت گزرتا رہا۔ جاوید کے کیس کی فائل دوسری سینکڑوں فائلوں کی طرح سرکاری محکموں میں گرد چاٹتی رہی۔ سرکاری دفتروں کے چکر کاٹتے کاٹتے ایک رات جب اکبر خان مایوسی اور نااُمیدی کے ساتھ گھر واپس لوٹا تو حسینہ باپ کی اندرونی

حالت بھانپ گئی۔موقع پاتے ہی وہ پوچھ بیٹھی:

''بابا! کیا بات ہے؟ آپ کیوں پریشان سے نظر آ رہے ہیں۔ جاوید کے کیس کا کیا ہوا؟''

''بیٹی......تم تو جانتی ہو کہ جاوید کی فائل کمشنر کے آفس میں پڑی ہے۔فائل کو آگے بڑھانے کے لئے کیس کا انچارج آفیسر ریلیف کی نصف رقم ایڈوانس مانگ رہا ہے۔ بیٹی گھر میں پھوٹی کوڑی تک موجود نہیں ہے۔ یہ لوگ انصاف کی کرسیوں پر بیٹھ کر مردہ انسانوں کے گوشت کو ٹکڑوں میں کھاتے رہتے ہیں۔''

حسینہ یہ سُن کر پریشان ہو گئی۔اُس نے سوچا کہ اس ناانصافی کے خلاف آواز اُٹھانا ضروری ہے آخر قانون بھی تو کوئی چیز ہے، میں کل ہی شہر چلی جاؤنگی۔شہر میں پریس ہے، میڈیا ہے، N.G.O's ہیں۔ وہاں میں بے بس انسانوں پر ہو رہے ظلم کے بارے میں ہر جگہ اپنی آواز پہنچا سکتی ہوں۔ دوسرے دن حسینہ شہر کی جانب چل پڑی۔شہر پہنچ کر اُس نے انصاف کو پانے کے لئے ہر ادارے کا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ایڈیٹر کو ایک دلدوز کہانی مل گئی اور میڈیا کو سنسنی خیز نیوز. N.G.O's کو احتجاج کرنے کے بہانے مل گئے اور سیاسی لیڈروں کو اپنی سیاست کی دکان چمکانے کے لئے ایک اور قیمتی ایٹم مل گیا۔ایک دن منسٹر کے پرنسل سیکورٹی آفیسر کی وساطت سے حسینہ کو ایک منسٹر تک اپنی آواز پہنچانے کا موقع

ہاتھ آیا۔ دو تین مہینے شہر میں گزارنے کے بعد حسینہ گھر واپس لوٹ آئی۔ بوڑھے ماں باپ اُس کی راہ تک رہے تھے۔ بیٹی کو دیکھ کر دونوں کے چہرے تمتما اُٹھے۔ چائے وغیرہ پینے کے بعد اکبر خان نے بے قراری کے عالم میں اُسے پوچھا۔

''بیٹی......معاملہ کہاں تک پہنچا۔ منسٹر صاحب نے جاوید کے کیس کے بارے میں کیا کہا؟ اور تمہاری نوکری......!''

حسینہ باپ کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''بابا......اس لالچی دنیا میں بغیر معاوضہ کے کوئی کام نہیں نکلتا ہے۔ میں نے بھی کام کا معاوضہ چکا دیا۔ میرا آڈر بھی تیار ہے۔''

والدین کو اس بار بیٹی کی آواز میں بڑی اُمید نظر آ رہی تھی۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ شاید راحت کے دن پھر سے لوٹ آئینگے۔ آخر وہ دن آ ہی گیا جب منسٹر ہزاروں لوگوں کے جلسے میں غریبوں کا مسیحا بن کر تشدد میں مارے گئے افراد کے لواحقین کو نوکریوں کے آرڈر بانٹ رہا تھا۔ آخر پر حسینہ کی نوکری کے آرڈر کا اعلان ہوا ۔حسینہ منسٹر کے ہاتھ سے آرڈر لیتے ہوئے بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑی۔ اُسے اسپتال پہنچایا گیا۔ خون کا ٹیسٹ کیا گیا۔ کچھ دیر بعد حسینہ کے بیڈ کے ارد گرد ایڈیٹر ، پولیس آفیسر، N.G.O's چلانے والے اور منسٹر سب کھڑے تھے۔ حسینہ کو یہ سب زہریلے سانپ دکھائی دے رہے تھے۔ اس کا پھول سا خوبصورت چہرہ

آہستہ آہستہ زرد ہورہا تھا۔ وہ اپنے بوڑھے لاچار باپ سے روتے روتے کہہ رہی تھی۔

’’بابا...... بابا......سب مددگار زہریلے ناخدا نکلے......مُنا کو انسان بنانا صرف انسان......!‘‘

ڈاکٹر نے جب اکبر خان کو حسینہ کی میڈیکل رپورٹ دکھائی تو اس میں لکھا تھا ’’ایڈز لاعلاج بیماری ہے۔‘‘



سفید تابوت

کالی کوٹھری کے اندھیرے تہہ خانے میں وہ جب اپنے بکھرے وجود کو سمیٹنے کی کوشش کرتا تو اندھیرے عالم کے خوفناک مناظر اس کی نیند پر شبخون مارنا شروع کر دیتے اور اس کے ذہن میں شعور‘ لاشعور اور تحت شعور کے بکھرے خیالات کے درمیاں تصادم شروع ہو جاتا۔

بھیانک خوابوں کے وحشت ناک سائے اس کے دل کی دھڑکن میں ابال لاتے اور وہ ہڑبڑاتے ہوئے بستر سے اُٹھ بیٹھتا۔ اس کی سانس پھول جاتی اور وہ رات بھر دیوار سے ٹیک لگائے خون بار آنکھوں سے تہہ خانے کی زنگ آلود آہنی سلاخوں کو دیکھتے رہ جاتا۔ اندھیرے عالم کے وحشت ناک مناظر‘ اس کے لئے سوہانِ روح بنے ہوئے تھے۔ کالی بلاؤں کی خوفناک چیخیں‘ مردہ خور کرگسوں کی سرخ رنگ چونچیں‘ کینچلی بدلتے رہتے کالے ناگوں کی پھن مارتی کُنڈلیاں‘ جنگلی پاگل کتوں کی لال ٹپکتی زبانیں اور سفید تابوتوں کی یورش کے درمیان خوش نما عقابوں کی پروازیں......!!!

لمبے عرصے سے اُس کی بے قرار آنکھیں کسی معبّر کی راہ تک رہی تھیں تا کہ ان خوفناک خوابوں کی تعبیر پا کر وہ اپنے بکھرے وجود کو سمیٹ سکے۔ایک رات...... ہاں......ایک خوش نصیب رات، وہ معبّر کو پانے میں کامیاب ہو گیا۔اس کی سوچ، شعور سے لاشعور اور لاشعور سے تحت شعور کے گہرے سمندر کی تیز رفتار موجوں پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئی۔تحت شعور کی تیز رو نے اُسے وقت کے اُس نورانی ماحول میں پہنچا دیا جہاں معبّروں کی روشن قندیلیں نور بکھیر رہی تھیں۔ وہ معبروں کی سماعتوں کے حوالے اپنے پراسرار خوابوں کی دُکھ بھری کہانی سناتا رہا اور معبّر بڑی خاموشی سے درد بھرے سمندر کا مشاہدہ کرتے رہے۔

کئی درد بھرے شب گزر گئے۔ وہ بڑی بے چینی کے ساتھ تعبیر کا منتظر رہا۔اچانک ایک خوبصورت چاندنی رات کے درمیان اُسے اندھیرے تہہ خانے میں چلنے کی آہٹ سنائی دی۔اُس پرانجانا سا خوف طاری ہو گیا۔دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ چند لمحوں کے اندر اندر کسی پتھر کے گرنے کی سی آواز سنائی دی اور آہٹ کی سنسناہٹ بند ہو گئی۔ وہ نیند بھری آنکھوں سے گرنے والی شئے کو اندھیرے میں ٹٹولنے لگا۔اُسے ایک صندوق نما شئے سے ٹھوکر لگی۔ٹھوکر لگنے کے ساتھ ہی اُس کا ہاتھ صندوق کے تالے پر پڑ گیا۔اُس کو ایک جھٹکا سا لگا اور صندوق کا ڈھکن کُھل گیا۔صندوق سے ایک تیز روشنی نکلی، جس سے تہہ خانے کے در و دیوار روشن

ہو گئے ۔ وہ بڑے غور سے صندوق کا جائزہ لینے لگا۔صندوق کے بدلے یہ سبز رنگ تابوت تھا۔تابوت میں ایک خوش رنگ موٹی کتاب تھی جس پر سنہرے حروف سے ''تعبیر نامہ خواب'' لکھا ہوا تھا۔اُس کے تھرتھراتے ہاتھ کتاب کی ورق گردانی کرنے لگے ۔ وہ اپنے ہر خواب کی تعبیر پا تا گیا۔رات کے آخری پہر اُس نے جو نہی سبز رنگ تابوت کو کاندھوں پر اُٹھایا تو شدید زلزلے کی وجہ سے اندھیرے تہہ خانے کے درو دیوار میں شگافیں پڑنے لگیں ۔روشنی کی کرنیں کالے اندھیرے کو چیرتی ہوئی فضائے بسیط میں پھیلنے لگیں ۔اُس کے مضبوط کاندھوں پر سبز رنگ تابو ت دیکھ کر سبز رنگ عقاب جھنڈ کی صورت میں فضائے بسیط میں اُڑان بھرنے لگے ۔ وہ آگے بڑھتا رہا اور عقاب بھی اُس کی رفتار کے ساتھ ساتھ پرواز کرتے گئے ۔

اُس کی تیز رفتاری نے اُسے اُس کے خوابوں کی سنہری وادیوں میں پہنچا دیا۔سنہری وادیوں کی اپنی ایک شاندار تہذیب تھی ،اپنا ایک شاندار تمدّن تھا۔اس شاندار تہذیب وتمدّن کے روشن میناروں نے دنیا کی اندھیرے غاروں میں روشنی کی کرنیں پھیلائی تھیں اور جاہلیت کے اندھیرے غاروں میں بسنے والے مچھلی فروشوں کے کالے دماغوں میں نور کی کرنیں بھر دی تھیں ۔ان نورانی کرنوں کی بدولت ہی وہ قزاق فطرت بنجر ذہن اپنی ناتواں سوچ کو تہذیب وتمدّن کی سر سبز

وشاداب دنیا بسانے پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

وقت کا دریا بہتا رہا۔ موسموں کی گردش جاری رہی۔ سنہری تہذیب وتمدّن کی وادیوں سے بہار کی رونق ختم ہونے لگی۔ ہیرے کی کانوں میں کوئلوں کے ڈھیر جمع ہونے لگے۔ متحرک سوچوں میں جمودی افکار کی آزمائش ہونے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے وقت کے تیز بہاؤ نے تہذیب وتمدّن کی ان سنہری وادیوں کو ماضی کا حصہ بنا دیا۔ نئے زمانے کی ہوائیں چلنے لگیں۔ موسم نئی نئی بہاروں کو اپنے ساتھ لاتا گیا۔ سنہری وادیوں کے ماضی اسیر پرندے آنکھیں بند کر کے اپنی چونچ اپنے پروں میں چھپائے گہری نیند میں کھو گئے۔ ان کی سنہری وادیوں پر خزاں کے سائے چھا گئے اور ان کے شاندار تہذیب وتمدن کو نئے بہاروں کے کرگسوں نے اپنا لیا۔ ان کرگسوں کے بے جان پروں میں جونہی اُڑنے کی طاقت آ گئی تو ان کی قزاق فطرت نے اپنی خصلت دکھانا شروع کر دی۔ یہ مردہ خور کرگس سنہری وادیوں پر اپنا منحوس سایہ ڈالنے کے لئے پر تولنے لگے اور بدلتے وقت کے ساتھ ساتھ یہ مردہ خور کرگس ان وادیوں کے گلستان میں آزادانہ اُڑانیں بھرنے لگے۔ انہوں نے جب اپنی بدبودار سانسوں سے گلستانوں کی معطر فضاؤں کو آلودہ کرنا شروع کیا تو سنہری وادیوں کے بے خود پرندوں کی آنکھیں کُھلنے لگیں۔ وقت کا دریا تیزی کے ساتھ بہتا رہا۔ لمحوں نے صدیوں کا روپ دھار لیا۔ نئے دور کے

نئے موسموں میں سنہری وادی کے بے ہوش پرندے اب ہوش میں آنے لگے۔ وہ اپنے گمشدہ تہذیب وتمدن کو دوبارہ پانے کی جستجو کرنے لگے اوران مردہ خور کرگسوں سے اپنے گلستانوں کو پاک کرنے کے لئے دھیمی دھیمی اُڑانیں بھرنے لگے۔

مردہ خور کرگسوں کو جب اپنی آزادانہ اُڑانوں کے ساتھ ساتھ دوسرے پرندوں کی اُڑانیں نظر آنے لگیں۔ تو ان قزاق فطرت مردہ خور کرگسوں سے یہ اُڑانیں برداشت نہ ہوسکیں۔ وہ اپنے خون پسند چونچوں سے ان پرندوں کے پرنوچنے لگے۔ ان کی چیر پھاڑ سے فضا میں خون کی بُو پھیلنے لگی۔ کئی پرندے ناتواں بنادیئے گئے۔ کرگسوں کی اس دہشت انگیز خصلت نے ریشم فطرت پرندوں کو عقابی خصلت اپنانے پر مجبور کردیا۔ فضائے بسیط میں خونین جھپٹ پلٹ شروع ہوگئی۔ کرگسوں کی حمایت میں رال ٹپکتے جنگلی پاگل کُتے اور کینچلی بدلتے کالے ناگ بھی سامنے آگئے۔ سبز رنگ عقابوں کے جاں فشاں حملوں سے مردہ خور کرگسوں اوران کے حواریوں کے دل بیٹھنے لگے اور وہ نفسیاتی شکست سے فریسٹریشن کے شکار ہونے لگے۔ عقابوں کے جوابی حملوں کے جوش کو ٹھنڈا کرنے کے لئے اپنی حیوانیت کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے مردہ خور کرگسوں نے عقابوں کے نشیمنوں میں زہریلی سانسیں چھوڑنے کا سلسلہ شروع کردیا۔ یہ زہریلی سانسیں جب کسی

نشیمن میں داخل ہو جاتیں تو بڑے عقابوں کے ساتھ ساتھ ان کے چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کو بھی آن کی آن میں موت کے گھاٹ اُتار دیتیں۔ ان وحشی حربوں سے بھی جب سبز رنگ عقابوں کے حوصلے پست نہ ہوئے تو مردہ خور کرگسوں کی تشویش میں اضافہ ہونے لگا۔ کیونکہ یہ مردہ خور کرگس نہ صرف عقابوں کے پُر تاثیر تالابوں سے اپنی ہوس کی پیاس بجھاتے تھے بلکہ ان کے گلستانوں کی زرخیز مٹی کے پوشیدہ سنہرے بیجوں کو بھی اپنے قزاقی پیٹ میں ہضم کر جاتے۔ ان مردہ خوروں کی استحصالی فطرت کو ختم کرنے کے لئے جب عقاب موت بن کر ان کے سروں پر چھا جانے لگے تو ان کو عقابوں کے گلستانوں پر اپنی حیوانی گرفت کا دائمی خواب چکنا چور ہوتے ہوئے نظر آنے لگا۔

مردہ خور کرگسوں اپنی استحصالی فطرت کو دوام بخشنے کے لئے بدلتے موسموں کے ساتھ ساتھ نت نئے حربے استعمال کرتے گئے۔ اپنے حواریوں سے صلح مشورہ کرتے ہوئے انہوں نے ایک پُر فریب پالیسی اپنائی اور پرندوں کی ذات سے چند بجو کا صورت پرندوں کو ان کے گلستان کا مالی بنا ڈالا لیکن عقاب جب اس سازش سے بھی اپنے جاں فشاں حملوں سے باز نہیں آئے تو انہیں قابو کرنے کے لئے مردہ خوروں نے اپنا آخری سخت ترین دھاؤ کھیلا۔ یہ آخری دھاؤ سفید تابوتوں کی یورش تھی۔ سفید تابوتوں کی یورش نے گلستانوں پر زلزلہ طاری کر کے عقابوں

کے ٹھکانوں کو زمین بوس کرنا شروع کر دیا۔سینکڑوں عقابوں کی جلی کٹی لاشوں کے خونین مناظر نے زندہ عقابوں پر وحشت طاری کر دی۔ان کے گلستان ویران ہوتے گئے۔...... برباد ہوتے گئے۔

وہ عقابوں پر چھائی جارہی وحشت کو بھانپ گیا۔اُس کا غم زدہ ذہن سفید تابوتوں کی خونین صلیب توڑنے کے بارے میں سوچ کے سمندر میں ڈوب گیا۔اس کا شعور، لاشعور اور تحت شعور ایک ساتھ جاگ اُٹھا۔کاندھے پر اُٹھائے ہوئے سبز رنگ تابوت کو فلک بوس پہاڑ پر رکھتے ہی عقابوں کے جُھنڈ اُس کے اردگرد طواف کرنے لگے۔سبز رنگ تابوت کا ڈھکن اُٹھتے ہی ''تعبیر نامہ خواب'' کے سنہرے اوراق فضا میں پھیلنے لگے۔اوراق اُڑنے کے ساتھ ہی سبز رنگ تابوت فضائے بسیط میں گھومنے لگا۔دیکھتے ہی دیکھتے عقابوں کے جُھنڈ اپنی چونچ میں تعبیر نامہ خواب کے اوراق لے کر مردہ خور کرگسوں پر جھپٹ پڑے۔کرگسوں کے سفید تابوت عقابوں کے سبز تابوتوں سے ٹکرانے لگے۔پہاڑوں کے خاموش آتش فشاں ابلنے لگے اور ان کے پھٹتے ہی زمین کا وجود ہلنے لگا۔سمندر کی سونامی لہروں نے جب ساحلوں کو عبور کرتے ہوئے قزاق فطرت مردہ خور کرگسوں کے ٹھکانوں پر بھی حملہ کر دیا تو مردہ خور کرگس اپنے بزدل حواریوں سمت حواس باختہ ہو گئے۔طوفانی لہروں کے خوف نے اُن کی خون آلودہ چونچوں کو شل کر دیا۔اور انہوں نے

عقابوں کے گلستانوں سے فرار کا راستہ اختیار کرتے ہوئے سفید کبوتروں کو عقابوں کے جُھنڈ کی طرف روانہ کر دیا۔سفید کبوتر اپنی چونچ میں شاخِ زیتون لے کر عقابوں کے گلستانوں میں داخل ہوگئے۔عقابوں کے گلستان کا جائزہ لینے کے بعد انہوں نے مردہ خور کرگسوں کی شکست کا اعلان کر دیا اور شاخِ زیتون سے امن کا نقارہ بجانے لگے۔

نئے دور کا آغاز ہو رہا تھا۔سفید تابوت کی صلیب ٹوٹ چکی تھی۔مردہ خور کرگسوں کی خون آلودہ چونچ پر زہریلا زنگ لگنے کی وجہ سے ریزہ ریزہ ہو چکی تھیں۔وہ بڑے اعتماد کے ساتھ اپنے گلستانوں کی شادابی کا نظارہ کر رہا تھا۔ان کی خوشبودار ہواؤں سے سرشار ہو رہا تھا۔پرندے پُرمسرت بہار میں چہچہار ہے تھے۔وقت کے دریا کا بہاؤ ماضی کو چھوڑ کر مستقبل کی جانب بڑھ رہا تھا۔

عقاب......اپنی سنہری وادیوں کے سرسبز وشاداب گلستانوں کی آزاد فضاؤں میں فخر احساس اُڑانیں بھر رہے تھے اور ان کی بلند پروازی کی متحدہ صدائیں فضائے بسیط میں گنگنا رہی تھیں ۔

ہم نے توڑی روایات کی زنجیر سُنو
اِک نئے دور کا آغاز ہوا ہے ہم سے
(فرقت کیفی)

بہشت کی پکار

شب تاریک جب اپنے بھیانک سایوں سے وادی بہشت کے طول وعرض کو ڈھانپ لیتی تو وادی امان ہو کے عالم کی اسیر ہو جاتی۔ بھیانک سائے کے خوف و ڈر سے پیدا شدہ عجیب وغریب قسم کی چیخ وپکار اونچے اونچے مضبوط پہاڑوں پر بھی زلزلہ طاری کر دیتی اور یہ دل خراش چیخیں جب پہاڑوں سے ٹکرا کر واپس آتیں تو باشندگانِ بہشت کے خوف زدہ دل ودماغ پر اور بھی دہشت طاری کر دیتیں۔ قابض خونخوار بھوت پریتوں نے وادی بہشت کے چپے چپے کو اپنے خون ریز آہنی پنجوں سے دبائے رکھا تھا۔ بہشت کے اسیر وارث، جن کی ذہانت کا اعتراف زمانہ صدیوں سے کرتا آیا تھا، ظلم سہتے سہتے فریسٹریشن کے شکار ہو چکے تھے۔ برسوں سے وہ سکون کے لئے تڑپ رہے تھے۔ ان کی نیند بھری آبدیدہ نگاہیں ایک زمانے سے تر بتر تھیں۔ یہ ستم زدہ لوگ ہکلاتی زبان سے کاتب تقدیر سے التجاء کرتے رہتے کہ ''اے کاش! ہماری نئی نسل کو پرندوں کی جون میں بدل دے تا کہ وہ ان

درندوں کے ظلم وستم سے نجات پا سکے اور مستقبل کی آزاد فضاؤں میں آزادی کے ساتھ پرواز کر سکے۔'' یہ لوگ جب راحت پانے کے لئے سونے کی کوشش کرتے تو ڈراؤنے خواب ان کی نیند پر شب خون مار کر انہیں نیم خوابی کے بھنور میں چھوڑ جاتے اور لحاف کا سفید کپڑا انہیں اپنے اپنے کفن دکھائی دیتے۔

اسیر زدہ وادیٔ بہشت کا وہ نیم بسمل شکار، جب اپنی زخمی روح کو سکون دینے کے لئے نیند کی آغوش میں لے جانے کی کوشش کرتا تو خونین جھیل کے سُرخ پانی کے اوپر تیرتی ہوئی خون آلودہ لاشوں کا خوفناک منظر اس کے وجود کو جھنجوڑ کر رکھ دیتا۔ وہ اس اضطراری کیفیت میں اپنے کانپتے وجود کے ساتھ سویرے کے انتظار میں کروٹیں بدلتا رہتا......لیکن......وہ سویرا......جس کا اسے انتظار تھا......آدھی صدی گزرنے کے بعد بھی کہیں سے بھی نمودار نہیں ہو رہا تھا۔ زندگی کی یہ آدھی صدی اُس نے بہشت میں ہونے کے باوجود بھی جیسے جہنم میں گزاری ہو۔ خونین جھیل کی تیرتی لاشوں کے خوفناک منظر نے ایک بار پھر اُس کی نیند کو توڑا اور وہ حسب عادت رات کے اندھیرے میں مکان کی چھت کی جانب دوڑ پڑا۔ وہ بوجھل قدموں سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ چھت پر پہنچ کر اُس نے وادی کے چاروں اور نظریں دوڑائیں۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گیا اور کُھلے آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس کا بدن خوف سے کانپ رہا تھا۔ ہر طرف

کرب انگیز خاموشی چھائی ہوئی تھی۔آسمان کے اُبھرتے ڈوبتے ستاروں کا منظر اُسے کبھی خوش اور کبھی غمگیں کر دیتا۔اُس کا ذہن خوشی اور غم کے اس چکرویو میں ابھی پھنسا ہوا تھا کہ اچانک گہرے بادلوں کے کالے گولے فضا میں ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔اس ٹکراؤ نے بجلیوں کا روپ دھار لیا اور کڑکتی بجلیوں نے وادی بہشت کو اپنی زد میں لایا۔بہت سارے خوش رنگ پھول راکھ کا ڈھیر بن گئے۔ طوفانی ہواؤں نے ہر طرف تباہی مچانا شروع کر دی۔وہ خوف زدہ ہو کر کافی دیر تک اپنے مقدر پر روتا رہا۔جب طوفان تھوڑا سا تھم گیا تو اُس نے آنکھیں کھولیں ۔ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا تھا اور وادی بہشت عجیب و غریب قسم کی چیخ و پکار سے لرز رہی تھی۔وہ مایوسی کے عالم میں سوچنے لگا کہ یہ طوفانی ہوائیں اور کڑکتی بجلیاں نہ جانے کب تک اس بہشت کے خوش رنگ پھولوں کی رنگت سیاہ کرتے رہیں گے۔

کہیں کہیں سے بجلیوں کے کڑکنے کی آوازیں آرہی تھیں اور طوفان کی رفتار کم ہو رہی تھی۔آسمان کا زیادہ تر حصہ صاف ہو رہا تھا۔آسمان پر چند ہی ستارے چمک رہے تھے باقی سب ٹوٹ چکے تھے۔آسمان ان فنا شدہ ستاروں کے غم میں خون کے آنسو بہا رہا تھا۔اُسے تھکن سی محسوس ہونے لگی اور اُس پر نیند کا غلبہ بھی طاری ہونے لگا۔وہ غنودگی کی حالت میں چھت سے نیچے اُتر کر اپنی خواب گاہ میں داخل

ہو گیا اور بستر پر سونے کے لئے لیٹ گیا۔ جونہی اُس کی آنکھ لگ گئی تو آدھی صدی سے چلا آ رہا ڈراونا خواب پھر سے اُس کی نیند میں خلل انداز ہو گیا اور خونین جھیل میں تیرتی ہوئی خوبصورت لاشوں کے خوفناک منظر نے جب اُس کی نیند کو توڑا تو اُسے محسوس ہونے لگا کہ وادی بہشت خونبار آنکھوں سے پکار رہی ہے......

آزادی......آزادی......!!!

ناقوس واذان

اسکول جاتے ہوئے ماسٹر گاش لال کی نظر غنی چاچا پر پڑی۔غنی چاچا اپنے چھوٹے بیٹے احمد کو سمجھا رہا تھا کہ بڑی ہوشیاری سے بھیڑوں کی رکھوالی کرنا، کہیں کسی کے کھیت کا نقصان نہ ہونے پائے اور شام کے وقت انہیں گِن کر گھر واپس لانا۔ ماسٹر گاش لال یہ سُن کر غنی چاچا کو اپنے ساتھ نزدیکی اسکول تک لے گیا اور غنی چاچا کو کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہنے لگا:

''غنی چاچا......! یہ اسکول سرکار نے آپ کے بچوں کے لئے کھولا ہے تاکہ آپ کے بچے تعلیم کے نور سے آراستہ ہو جائیں۔آپ کا چھوٹا بیٹا احمد بھی کل تک اسکول آتا تھا اور آج آپ نے اُسے بھیڑ بکریوں کی رکھوالی پر مامور کیا۔''

''ماسٹر جی''، غنی چاچا ادب کے ساتھ بول پڑا ''مجھے بھی احمد کو پڑھانے کا شوق ہے لیکن ماسٹر اکرم صاحب نے مجھ سے کہا کہ احمد ذرا کُند ذہن ہے، اُس کو سبق یاد نہیں رہتا ہے، بہتر یہی ہے کہ آپ اُسے کسی کام دھندے میں لگا دو۔''

''احمد کُند ذہن نہیں ہے'' گاش لال احمد کی تعریف کرتے ہوئے کہنے لگا'' وہ بڑا ذہن بچہ ہے۔ اُسے کل دوبارہ اسکول بھیجنا۔''

''نہیں، ماسٹر جی''،غنی چاچا کرسی سے اُٹھتے ہوئے بول پڑا۔''احمد اب بھیڑ بکریوں کی رکھوالی ہی کرے گا۔''

''نیچے بیٹھو'' گاش لال تُند لہجے میں بول پڑا۔'' آپ مسلمان ہیں اور میں ایک پنڈت ہوں۔ آپ کا قرآن شریف''اقراء'' کی تعلیم دیتا ہے یعنی پڑھو اور آپ مسلمان ہونے کے باوجود قرآن شریف کے حکم کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔''

''لیکن ماسٹر اکرم......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں'' گاش لال نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا''کل احمد کو پھر سے اسکول بھیجنا۔''

غنی چاچا کھیت کی طرف چلا گیا۔ہل جوتتے ہوئے اُس کے ذہن میں بار بار ماسٹر گاش لال کی''اقراء'' والی بات آتی رہی۔ وہ واپس گھر آیا اور احمد کا اسکولی بیگ ہاتھ میں اُٹھا کر بھیڑوں کے ریوڑ کی طرف چلا گیا اور احمد کو ساتھ لے کر اُسی دن اسکول پہنچ گیا۔ ماسٹر گاش لال یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا۔احمد بھی خوشی کے ساتھ کلاس میں چلا گیا۔

''میرے پاس اس وقت فیس نہیں ہے۔''غنی چاچا ماسٹر گاش لال سے کہنے

لگا۔ ''لیکن چند دنوں کے اندر اندر میں ضرور فیس بھیج دونگا۔''

''فکر کرنے کی کوئی بات نہیں'' گاش لال ایڈمیشن رجسٹر پر احمد کو درج کرتے ہوئے بولا۔''

''میں اپنی جیب سے اُس کی فیس ادا کر دوں گا لیکن تمہیں اُس کو ہمیشہ وقت پر اسکول بھیجنا ہوگا۔''

غنی چاچا' ماسٹر گاش لال کا شکریہ ادا کرتے ہوئے وہاں سے چل پڑا۔

یہ ایک خوشحال بستی تھی' جس کی تاریخ صدیوں کے آپسی بھائی چارے اور انسانی قدروں کے پاسدار اُصولوں پر مبنی تھی۔ بستی کے بیچوں بیچ' وقت کے سرد و گرم ہواؤں سے بے نیاز ایک سبک رفتار کشادہ ندی قرنوں سے اپنی گود میں برفیلے پانی کے میٹھے خزانے سمائے ہوئے رواں دواں تھی۔ ندی کے ایک طرف کثیر تعداد میں مسلمان آباد تھے اور دوسری جانب پنڈتوں کی قدرے قلیل آبادی موجود تھی۔ مسلمانوں کی اکثریت ان پڑھ تھی۔ اور زیادہ تر اپنے کھیت کھلیانوں میں ہی کھیتی باڑی کا کام کرتے رہتے تھے۔ پنڈت برادری زیادہ تر پڑھے لکھے لوگوں پر مشتمل تھی۔ ان میں اکثر سرکاری ملازم تھے۔ ندی کے صاف وشفاف پانی کی تاثیر نے بستی کی فطرت میں شیر وشکر والی مٹھاس گھول دی تھی۔ پیار ومحبت دونوں فرقوں کی مشترکہ میراث تھی اور ایک دوسرے کے غم وخوشی میں یہ لوگ بلاتفریق مذہب

وملت پیش پیش ہوتے تھے۔ مسلمانوں کی مسجد سے جب صبح کی اذان فضا میں گونجتی تو مندر سے بھی ناقوس کی صدا بلند ہوتی تھی۔ پرندے دونوں آوازوں کو سن کر پیڑوں پر خوشی سے چہچہانا شروع کر دیتے تھے۔ ندی کے تیز رو پانی سے مسلمان صبح کی نماز کے لئے وضو بناتے تھے اور ہندو بھی پوجا پاٹ کے لئے اشنان کرتے تھے۔ دونوں فرقوں کی عورتیں صفائی پکائی کے لئے مٹکوں میں پانی بھر بھر کر ہنستے مسکراتے ایک دوسرے کا حال چال پوچھتی رہتی تھیں۔ ماسٹر گاش لال اور غنی چاچا اس بستی کے پشتنی باشندے تھے۔ بستی میں اگر کبھی کبھار کوئی ناخوشگوار واقع پیش آتا تو یہ دونوں پہل کر کے صورتحال کو سنبھالنے کی کوئی نہ کوئی سبیل ضرور نکال لیتے. دونوں کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ وہ بستی کا کوئی بھی پیچیدہ مسئلہ دور اندیشی سے حل کر دیتے تھے۔

بستی کے لوگ روایتی انداز میں سوچنے کے قائل تھے۔ خورونوش کا سارا انحصار کھیت کھلیانوں پر تھا اس لئے وہ بڑی سادگی کے ساتھ اپنے بچوں کو پڑھنے پڑھانے کے برعکس کھیتی باڑی کے کاموں کی ترغیب دیتے تھے۔ گاش لال ایک سینئر ماسٹر تھا۔ وہ ہمیشہ وقت پر اسکول جایا کرتا تھا اور چھٹی کے بعد بستی والوں کو وقتاً فوقتاً تعلیم کی اہمیت سمجھاتے ہوئے انہیں اپنے بچوں کو اسکول بھیجنے پر آمادہ کرنے کی کوشش بھی کرتا رہتا۔ ایک دن ماسٹر گاش لال نصف دن کی رخصت کے بعد

اسکول کی طرف جارہا تھا۔اُس نے راستے میں احمد کواسکولی بیگ لئے روتے بلکتے ہوئے دیکھا۔نزدیک پہنچ کر وہ احمد سے پوچھنے لگا کہ وہ اسکول چھوڑ کر کہاں جارہا ہے۔احمد ہچکیاں لیتے ہوئے کہنے لگا کہ ماسٹر اکرم صاحب نے اُسے بہت پیٹا اور اسکول سے نکال دیا۔گاش لال اُسے بازو پکڑ کر واپس اسکول لے گیا۔اسکول پہنچ کر وہ ماسٹر اکرم کی کلاس میں چلا گیا اور احمد کو کلاس میں بٹھاتے ہوئے اکرم صاحب سے پوچھ بیٹھا:

''آپ نے احمد کو کیوں کلاس سے نکال دیا؟''

''اس کے پاس کبھی بھی کاپی نہیں ہوتی ہے۔'' ماسٹر اکرم نے ناگواری سے جواب دیا۔

''اُس کے باپ کو بتادینگے'' وہ کاپی لے آئے گا۔گاش لال نے نرم لہجے میں کہا۔'' اس بات پر بچے کی پٹائی کرنا کچھ اچھا نہیں لگتا۔''

''یہ میری کلاس ہے'' ماسٹر اکرم تیز لہجے میں بول پڑا'' اوراس میں کسی کو داخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے''۔

''مداخلت کی بات نہیں ہے۔یہ فرض کا معاملہ ہے اوراس کے لئے ہم تنخواہ لیتے ہیں ہم تعصب سے کام لے کر کسی کو تعلیم کے نور سے محروم کیوں کریں۔پڑھانا ہمارا پیشہ ہے۔تعلیم کا پیشہ پیغمبروں کا پیشہ ہے' اس کے ساتھ انصاف کرو۔''

''اچھا'' اب مجھے ایک پنڈت سے دین سیکھنا پڑیگا'' ماسٹر اکرم آپے سے باہر ہو گیا۔

''اپنے آپ کو بڑا مسلمان سمجھتا ہے'' ماسٹر گاش لال کو بھی غصہ چڑھ گیا'' تم ان معصوموں کو ان پڑھ رکھنا چاہتے ہو تا کہ ان کی زندگیاں صرف دوسروں کا بوجھ اُٹھانے تک ہی محدود رہیں' تمہارے کام سے شیطان بھی شرمائے۔'' کافی تو تکار کے بعد ماسٹر گاش لال نے جیب سے پیسے نکال کر یہ کہتے ہوئے احمد کو دے دیئے کہ کل کاپی ساتھ لے آنا تمہیں اسکول سے کوئی نہیں نکال سکتا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ احمد بھی پڑھائی میں آگے بڑھتا رہا۔ ماسٹر گاش لال نہ صرف احمد بلکہ اپنے دوسرے شاگردوں کی بھی بڑی شفقت سے رہنمائی کرتا رہتا۔ آگے چل کر اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز ہونے کے باوجود تمام شاگردوں کے دلوں میں اپنے شفیق استاد کا احترام موجود تھا۔ احمد پڑھ لکھ کر اُستاد بن گیا اور اپنے شاگردوں پر اپنے شفیق استاد کی طرح ہی شفقت بکھیرنے میں بخل نہیں کرتا رہا۔

وقت کا مزاج اچانک بدل گیا۔ بستی کے مثالی بھائی چارے پر بدامنی کے منحوس بادل چھا گئے۔ خوف ودہشت کی تُند ہوائیں گھر گھر میں پھیل گئیں۔ اندھے بندوق کا رعب چارسو چھا گیا۔ بھائی بھائی سے خوف کھانے لگا۔ پنڈت برادری کے دلوں پر خوف کا اثر کچھ زیادہ ہی پڑ گیا۔ خوف کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے سیاسی

سوداگروں نے انہیں اپنے گھروں سے بے گھر ہونے پر اُکسایا اور وہ ناچاہتے ہوئے بھی چھپ چھپائے جموں کی جانب بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ ماسٹر گاش لال کے لڑکے روس میں سروس کرتے تھے۔ وہ خوف زدہ ہونے کے باوجود کسی بھی ایجنسی کے جھانسے میں نہیں آیا۔ مسلم برادری نے یہ کہتے ہوئے اُس کی ہمت بندھائی کہ وہ اس آفت کا مل جل کر مقابلہ کرینگے اس لئے وہ بستی کے مثالی چارے کو توڑ کر یہاں سے جموں نہ چلا جائے۔ گاش لال کو اپنی جنم بھومی سے محبت تھی، اپنے کشمیر سے پیار تھا، یہاں کا مثالی بھائی چارہ اُس کی روح کا حصہ بنا ہوا تھا۔ مسلم برادری کے خلوص و محبت نے اُس کے دل کو مطمئن کر دیا اور اس نے بیوی کے ساتھ اپنے اصلی گھر میں ہی قیام کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ غنی چاچا نے اپنے بیٹے احمد کا ہاتھ پکڑ کر یہ کہتے ہوئے گاش لال کے ہاتھ میں تھما دیا کہ آج سے وہ احمد کو اپنا بیٹا سمجھ لے۔ احمد نے اپنے استاد کی خبر گیری کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔

پندرہ برس گزر گئے۔ بستی کے حالات ابھی بھی کشیدہ تھے لیکن ماسٹر گاش لال کو کبھی بھی اپنے فیصلے پر پچھتاوا نہ ہوا۔ بستی کے لوگ اُس کے دُکھ سکھ میں ہمیشہ شریک رہے۔ ایک مرتبہ بستی کے لوگ نئی مسجد تعمیر کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے لیکن مناسب جگہ نہ ملنے کے باعث کچھ رکاوٹ پیش آ رہی تھی۔ باتوں باتوں میں یہ خبر ماسٹر گاش لال تک پہنچی۔ رات کو بستر پر لیٹتے ہی وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اُس

کے ذہن میں بستی کے گزرے ہوئے بھائی چارے کی حسین یادیں تازہ ہوگئیں۔ اسے اپنے بیٹے جواہر لال کی شادی کا وہ دن یاد آیا جب مسلم برادری اپنے اپنے گھروں سے بھیڑ بکریاں، مرغ اور چاول لائے تھے۔ مہمانوں کی بھرپور خاطر داری کی تھی اور مسلمان عورتوں نے پنڈت عورتوں کے سُر سے سُر ملا کر لکشمی دلہن کا دل سے سواگت کیا تھا۔ صبح ہوتے ہی ماسٹر گاش لال نے تمام مسلم برادری کو اپنے گھر بُلا لیا۔ تمام لوگ جمع ہوگئے۔ ماحول پر ایک گھمبیر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سبھی سوچ رہے تھے کہ ماسٹر جی کو یہ اجلاس بُلانے کی ضرورت محسوس کیوں ہوئی؟ کہیں کوئی معاملہ تو نہیں ہوا ہے اور بستی کو خبر نہیں۔ گاش لال نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا:

''نئی مسجد شریف بنانے کا پروگرام کہاں تک پہنچا۔''

''زمین کم ہے، ابھی فیصلہ نہیں ہو پایا۔'' غنی چاچا نے کہا۔

گاش لال نے تکئے کے پیچھے سے کاغذات کا ایک پلندہ نکال کر برادری کے سامنے رکھ دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' غنی چاچا نے پوچھا۔

''میری زمین کے کاغذات'' گاش لال نے جواب دیا'' میں چاہتا ہوں کہ میرے گاؤں کی مسجد میری زمین پر بنے۔''

گاش لال نے اپنی زمین کے کاغذات یہ کہتے ہوئے مسجد کمیٹی کے چیرمین کے حوالے کر دے کہ میں بلا معاوضہ اپنی زمین مسجد شریف بنوانے کے لئے آپ لوگوں کو دیتا ہوں۔مسلم برادری کو برسوں کا پُرانا مثالی بھائی چارہ یاد آ گیا اور تمام لوگ آنسو بہانے لگے۔

چند برس اور بیت گئے۔سرما کا موسم تھا۔ماسٹر گاش لال سخت بیمار پڑ گیا۔بستی کے لوگ رات دن اُس کی خبر گیری کرتے رہے۔علاج معالجہ ہوتا رہا لیکن گاش لال کی حالت روز بروز بگڑتی گئی۔اُسے جب یقین ہو گیا کہ زندگی کا آخری وقت آ گیا تو اُس نے احمد کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر یہ کہتے ہوئے آخری سانس لے لی کہ وہ اس کی چتا کو بڑے لڑکے کی طرح آگ لگائے گا۔تمام لوگ دہاڑیں مار مار کر رونے لگے۔سڑکوں پر چار پانچ فٹ برف جمی ہوئی تھی۔راستہ بند ہونے کی وجہ سے ماسٹر گاش لال کے رشتہ دار جموں سے کشمیر نہ آ سکے۔مسلم برادری نے ہندو رسم کے مطابق گاش لال کی لاش کو نہلا دُھلا کر کفن پہنایا۔ماسٹر گاش لال کے دوسرے شاگردوں نے اپنے شفیق اُستاد کی ارتھی کو کاندھوں پر اُٹھا کر شمشان گھاٹ پہنچا دیا اور احمد گنگا جل مٹکی اُٹھائے آگے آگے چلتا رہا۔ماسٹر گاش لال کے ایک شاگرد نے ناقوس بجایا اور احمد نے چتا کو آگ لگا کر بڑے بیٹے کا حق ادا کیا۔بستی کی فضا پر سوگ کا ماحول چھایا رہا۔چند روز کے اندر اندر مسلم برادری نے

شمشان گھاٹ میں ماسٹر گاش لال کی سمادھی بنا ڈالی۔ سمادھی کو پھولوں سے سجایا گیا اور اس کے اوپر سنگ مرمر کا ایک پتھر رکھا گیا جس پر لکھا تھا:

''ناقوس واذان کا حقیقی پرستار......''



جنازے

وہ ایک آفت زدہ بستی تھی۔ وہاں طلوع آفتاب سے لیکر غروب آفتاب تک جنازے اُٹھتے رہتے تھے۔ اس بستی میں موت کا رقص کئی برسوں سے جاری تھا۔ کبھی بچے اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے اپنے بزرگوں کی لاش پر مٹی ڈالتے اور کبھی بزرگ اپنے ناتواں کندھوں پر اپنے جوان بچوں کا جنازہ اُٹھاتے رہتے۔ ہر ایک اپنی مستعار زندگی کا فکر مند تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ کب' کہاں اور کیسے موت کی آغوش میں چلا جائے گا۔ ہر گلی سنسان اور ہر کوچہ ویران دکھائی دیتا' صرف قبرستان آباد ہو رہے تھے۔ وحشی گِدھ ہر وقت بستی کے اوپر منڈلاتے رہتے تھے۔ ہر گھر سے خوف و ہراس کی گھنٹیاں بجتی رہتی تھیں۔ ہر ذی حس سوچنے سے قاصر تھا کہ کس طرح ان وحشی خونخوار گِدھوں کے عذاب سے نجات مل سکتی ہے؟ اور کب اس بستی کے چمنستانوں کو خوشحالی کی خوشبودار ہوائیں نئی رونق سے نوازیں گی؟ کب ہمیں اس ظالم گھٹن سے آزادی ملے گی؟ بستی کا ہر فرد زندہ لاش نظر آتا تھا اور

ذہنی تناؤ اور ہارٹ اٹیک کا ماحول اس بستی کے انسانوں کا مقدر بن چکا تھا۔ ان کے دلوں سے صرف بدنصیبی کی آہیں نکلتی رہتی تھیں اور ان کی آنکھیں رو رو کے پتھر ہو چکی تھیں۔ ٹوٹتے دلوں کی آوازوں کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔

بچے جب اپنے بزرگوں سے اس سانحہ کی تاریخ کے بارے میں پوچھتے تھے اور ان کی بستی میں ان وحشی گِدھوں کی آمد کا سوال کرتے تو افتادہ زدہ بستی کے یہ غم زدہ بزرگ یہ سوچ کر بچوں کے سوال کو ٹال دیتے تھے کہ اگر انہوں نے انہیں ان مردہ خور گدھوں کی اصلیت سے آگاہ کیا تو نہ جانے اس نسل کا کیا حشر ہوگا جن سے ہماری اُمیدیں وابستہ ہیں۔ لیکن بستی کی ویرانی نئی نسل کے ذہنوں کو روز بروز کوستی رہتی اور جوں جوں ان کی سوچ بڑھنے لگی اُن کو خود بخود اس ویرانی کا سبب معلوم ہونے لگا۔ وہ اپنے گلستانوں میں ویرانی کے بدلے خوشحالی لانے کے لئے تڑپنے لگے۔ اُن کی تڑپ بغاوت میں بدل گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے بستی کی یہ نئی نسل خوشحالی لانے کی تاریخ کا حصّہ بننے لگی۔

موسم بدلتے رہے۔ سوچیں بدلنے لگیں۔ ہر موسم اپنے ساتھ نئے نئے گِدھ ساتھ لاتا گیا لیکن خوشحالی کی متمنی اس نسل کا جوش اور اُبلنے لگا۔ ان کی زبان پر صرف ایک لفظ تھا خوشحالی......خوشحالی......! بستی کے بزرگ ابھی اپنے نوجوان نسل کی خون ٹپکتی لاشوں کو بھول نہیں پائے تھے کہ نئی نسل نے بھی وہی راہ اختیار کر لی۔ یہ نسل

بڑی ہوشمندی کے ساتھ خوشحالی کے لئے جدوجہد کرنے لگی۔ وہ اپنے اسکول بھول گئی۔اپنی خوشیاں چھوڑ بیٹھی۔ وہ پڑھنے کے بدلے اپنے مقصد سے پیار کرنے لگی اوران کا مقصد تھاان وحشی گِدھوں کواپنے خوبصورت گلستان سے نکال پھینکنا۔

انہوں نے خوشی کے کھلونوں کے بدلے غم کے پتھر ہاتھوں میں اُٹھائے اوران اجنبی وحشی گِدھوں کونشانہ بناتے گئے۔پتھروں نے وحشی گِدھوں میں ہلچل مچادی ۔ان کونئ نسل کا مقصد سمجھ میں آ گیا۔ان کو یہ نا گوارگزرا کہ وہ ان شاہین صفت بچوں کے گلستان پرایک عرصہ سے راج کرتے آئے ہیں اوراب یہ ہمیں یہاں سے بھگانے کی کوشش کررہے ہیں۔ایسا ہم ہونے نہیں دینگے۔ان وحشی گدھوں نے ان شاہین صفت بچوں پر جھپٹناشروع کردیااوراپنے خونخوارنوکیلی چونچوں سے ان کے دل ودماغ کونوچنے لگے۔نئ نسل بغیر ہمت ہارے جان کی بازی لگا کران وحشیوں پرپتھروں سے وارکرتے گئے۔بستی کی مٹی سرخ ہوتی گئ۔گلی گلی سے خون کی ندیاں بہتی رہیں۔خونخوار گِدھ بستی کے ہرفردکواپنے زہریلے پنجوں سے چیر پھاڑ کرر کھ دیتے۔

ہرگھر سے ماتم کی صدائیں آرہی تھیں۔ بہار بھی خزاں کی یاددلا رہی تھی۔ بزرگ ناچاہتے ہوئے بھی اپنی نئ نسل کوگھروں میں قید کرکے رکھتے تھے۔لیکن عارضی خاموشی جلدہی ٹوٹ جاتی اورنئ نسل موقع ملتے ہی وحشی گِدھوں پرٹوٹ پڑتی۔ ہر

طرف موت کی چیخیں سنائی دیتیں۔ پلٹ جھپٹ کا یہ سلسلہ چلتا رہا، بڑھتا رہا۔ بستی والوں کی پرنم آنکھیں آسمان کے چمکتے ستاروں کے فیصلے کی منتظر تھیں لیکن آسمان کے چمکتے ستارے اپنے مقصد اور مفاد کے مطابق اپنے فیصلے بدلتے رہتے۔ ہر ستارہ نئی نئی سازش کا جال بنتا گیا۔ بستی کے گلستان قبرستان میں تبدیل ہوتے گئے۔ اور گلشن کے پھولوں میں خون کی سرخی نمودار ہوتی گئی۔ نوجوان نسل کی خوبصورت لاشوں کو مٹی کے حوالے کرتے ہوئے بزرگوں کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ خوف و ہراس کی بدنصیب ہواؤں سے ان کے کمزور جسم لڑکھڑا رہے تھے۔ اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ بستی کے سبھی لوگ اپنے مستقبل کو سنوارنے کے لئے اپنے اپنے جنازے میں گم ہیں۔



مشنِ القدس

ہوش میں آتے ہی اُس نے اپنی نظریں چہار جانب گھمائیں۔اپنے اردگرد ہتھیار بند افراد دیکھ کر وہ گھبرا سا گیا۔وہ بیڈ سے اُٹھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اُٹھ نہ سکا۔وہ اپنے اردگرد انجانے چہروں کو غور سے دیکھنے لگا۔

انجانے چہروں کے حُلیے نے اس پر وحشت طاری کر دی۔اُس کی تشویش میں اضافہ ہونے لگا۔ایک آدمی اُس کے سامنے دودھ کا گلاس رکھ کر کمانڈر کے پاس چلا گیا۔کمانڈر کا بارعب چہرہ دیکھتے ہی اُس کے ہوش اُڑ گئے۔کمانڈر اُس کے بیڈ پر بیٹھ گیا۔اور دودھ کا گلاس ہاتھ میں اُٹھا کر اُسے پلانے لگا۔یہ منظر دیکھ کر اُسے تھوڑا سا اطمینان تو ہوا لیکن دل اندر ہی اندر سے ڈوبتا جا رہا تھا۔

’’آپ کا نام ڈیوڈ ہیں۔‘‘ کمانڈر نے مسکراتے ہوئے پوچھا’’اور آپ ہمارے ملک میں ایک خفیہ مشن پر مامور ہو۔‘‘

کمانڈر کی غیر متوقع معلومات جان کر وہ حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گیا۔

’’گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں‘‘ کمانڈر اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بول

پڑا۔'' آپ اس وقت ہمارے مہمان ہیں اور مہمان کے ساتھ اچھا سلوک روا رکھنا ہمارا اخلاقی فرض ہے۔''

کمانڈر کی تسلی بخش باتیں سُن کر اُسے یک گونہ اطمینان ہوا اور اُس نے کمانڈر کی طرف ہاتھ بڑھا کر شکریہ ادا کیا۔ کمانڈر بیڈ سے اُٹھ کر نماز پڑھنے کی تیاری کرنے لگا۔ تمام لوگ اکٹھا ہو کر نماز پڑھنے لگے۔ نماز ادا کرنے کے بعد کمانڈر مجاہدین سے خطاب کرنے لگا۔

''ہم مجاہدین ہیں...... ہمارا مقصد دنیا میں امن و امان قائم کرنا ہے۔ ظالموں کو سزا دے کر مظلوموں کو انصاف دلانا ہے ہم مقدس جہاد کر رہے ہیں۔ ہمارے ہاتھوں کوئی بھی بے گناہ انسان قتل نہیں ہونا چاہیئے۔ ہمیں صرف ان لوگوں کے ساتھ لڑنا ہے جو ہمارے خلاف سازشیں رچا رہے ہیں اور جو ہمیں اپنا غلام بنانا چاہتے ہیں۔ ہمیں کسی مذہب کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں ہے، ہم چاہتے ہیں کہ دنیا کے تمام لوگ آزادی کے ساتھ باعزت زندگی گزار سکیں، چاہیئے ان کا کوئی بھی ملک ہو یا وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔''

کمانڈر کا خطاب سُن کر ڈیوڈ کا سر چکرانے لگا۔ حقیقت نے اس کے شبہات کو صاف کر دیا۔ وہ سوچنے لگا کہ میں اس وقت ان لوگوں کا دشمن ہوں اور انہوں نے مجھے میری تکلیف میں ہر طرح کا خیال رکھا۔ میری اصلیت جاننے کے باوجود بھی

یہ لوگ میرے ساتھ انسانیت سے پیش آرہے ہیں۔ یہ تو انسانیت کے سپاہی نظر آرہے ہیں پھر ہم انہیں دہشت گرد کی گالی کیوں دیتے ہیں۔

ڈیوڈ ایک سخت گیر یہودی تھا۔ وہ اُس ملک میں ''مشنِ القدس'' کے ایک خفیہ ایجنٹ کی حیثیت سے کام کررہا تھا۔ ایک دن اس کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا اور وہ بُری طرح زخمی ہوکر بے ہوش ہوگیا۔ مجاہدین اُسے زخمی حالت میں اُٹھا کر اپنے ٹھکانے پر لے گئے۔ آپریشن کرانے کے دوران انہیں شناختی کارڈ سے پتہ چلا کہ وہ مشن القدس کا ایک خفیہ ایجنٹ ہے جو اس ملک میں مجاہدین کا دوست نُما دشمن بن کر سازش کرانے کے لئے آیا ہوا ہے۔ چند مہینے مجاہدین کی نگرانی میں رہ کر وہ جب صحت یاب ہوا تو اُسے اپنے ملک واپس چلے جانے کا حکم ملا۔ وہ اپنے ملک واپس تو لوٹا لیکن اب مجاہدین کے اچھے برتاؤ اور انسانیت پرستانہ مقاصد نے اُسے ایک نئی سوچ عطا کی تھی۔ اُسے اپنے مشن پر ندامت ہورہی تھی۔ اُس کا دل چاہتا تھا کہ وہ بھی انسانیت کا سپاہی بن جائے۔ ایک دن اُسے جب اپنے کمانڈر کی مسیج مل گئی تو اُس نے ''مشن القدس'' کا وِڈیو آن کیا۔

''یہ گیم کھیلنے سے ہمیں کیا فائدہ ملے گا، سر'' جوزی نے دھیمی آواز میں کمانڈر سے سوال کیا۔

''آپ ہماری عالمگیر ایجنسی کی ایک نئی ممبر ہو، جوزی'' کمانڈر اسے سمجھاتے ہوئے

بولا''جونیر ہونے کی وجہ سے آپ کا تجربہ بھی ابھی کم ہے اس لئے اپنے مائنڈ کو صرف سننے کی حد تک ہی محدود رکھو۔''

''ایکس کوزمی سر......!جوزی کا سوال بڑا اہم ہے۔''ڈیوڈ نے بڑے مہذبانہ انداز سے پوچھا۔''جس مشن کا منصوبہ آپ بنا رہے ہیں یہ کوئی آسان مشن نہیں لگ رہا ہے۔''

''یوآر رائٹ مسٹر ڈیوڈ۔'' کمانڈر نے اسٹک سے ڈیوڈ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اس مشن کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ دو تہذیبوں کے درمیان ٹکراؤ پیدا کرنے کا مشن ہے۔''

''لیکن اسے تہذیبی تصادم کی ایک نئی جنگ کا آغاز ہوگا۔''ہین ٹیگسن کرسی سے اُٹھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔''مسٹر ہین ٹیگسن'' کمانڈر خوش ہو کر اُسے مخاطب ہوا''میں آپ کی سوچ کی داد دیتا ہوں، اس لئے آپ کو بڑی ذمہ داری کا کام سونپ رہا ہوں۔''

''تھینک یوسر'' ہین ٹیگسن نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔''پر وہ کونسا اہم کام ہے سر۔''

''مسٹر ہین ٹیگسن'' آپ ہمارے خفیہ گروپ کے ایک باشعور سینئر ممبر ہو۔'' کمانڈر میٹنگ ہال میں چہل قدمی کرتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے بولنے لگا۔''آپ

دونسلوں کی نفسیات کا فائدہ اُٹھا کر ایک ایسی مشکوک کتاب لکھیں گے جو دنیا کے انٹلیکچو ل مائنڈز کو بہت جلد اپنی مسیج سے متاثر کر یگی۔"

"تو مجھے اس نفسیاتی بم Psychological bomb کولوجیکل کیمسٹری Logical Chemistry کی تکنیک Technique سے تیار کرنا ہوگا۔"

ہین ٹیگسن کمانڈر کی تجویز سُن کر بول پڑا۔

"یس، یس......میرے پلان ماسٹر" کمانڈر جوشیلے انداز میں ہین ٹیگسن کو شاباشی دیتے ہوئے بولا۔

"او کے سر" ڈیوڈ استہفامیہ لہجے میں کہنے لگا۔"پلیز ہمیں اس مشن کے وجوہات اور مقاصد سے آگاہ کریں۔"

"ڈئیر فرنڈس" کمانڈر اپنی صدارتی کرسی پر بیٹھتے ہوئے خطاب کرنے لگا۔

"اس مشن کا مقصد ہماری نسل کی سُپر میسی اور خود اعتمادی کو بحال کرنا ہے۔اپنی مقدس سرزمین کو غیروں سے پاک کرانا ہے۔ہم اعلیٰ نسل کے وارث ہیں لیکن اعلیٰ نسل ہونے کے باوجود ہمیں دوسری کم تر نسلوں کے رحم وکرم پر زندہ رہنا پڑتا ہے۔ یہ تہذیبیں ہماری تہذیب کے بعد وجود میں آئیں لیکن اپنے پاور کے بل بوتے پر انہوں نے ہمیں خانہ بدوشی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا۔ہمیں اب اپنا مستقل ٹھکانہ چاہیئے ، یہ تبھی ممکن ہے جب ہم ان دونسلوں کو اپنے خفیہ سازشی نیٹ ورک

کے کنٹرول میں لائینگے۔''

''بہت خوب سر'' جوزی بے تابی کے ساتھ بول پڑی ''مشن کا مقصد تو سمجھ میں آ گیا۔اب مشن کے چلانے کے بارے میں بھی ہمیں بتائیے''۔

''ویل جوزی'' کمانڈر نے پلان کے بارے میں جانکاری دیتے ہوئے کہا۔

''مشن کے مطابق ان دونسلوں کے الگ الگ نام رہیں گے،سفید کرگس اور شاہین صفت کبوتر۔جوزی......تمہارے گروپ کے اوپر یہ ذمہ داری رہے گی کہ وہ سفید کرگسوں کے پاور کو شاہین صفت کبوتر مزاج نسل کے خلاف استعمال کرنے کا راستہ ہموار کرئینگے اور ڈیوڈ کے گروپ کا کام شاہین صفت کبوتر مزاج نسل کے جذبات کا فائدہ اُٹھا کر انہیں سفید کرگسوں کی بالا دستی کے خلاف استعمال کرنے کا ہے۔اس خفیہ مشن کا نام رہے گا۔''مشنِ القدُس''

مشنِ القدس نے اپنا سازشی منصوبہ بڑی چالاکی اور ہوشیاری سے شروع کیا۔چند ہی برسوں کے اندر اندر انہوں نے دونوں نسلوں کی نفسیات کو اپنے کنٹرول میں کرلیا۔دونوں نسلیں نفسیاتی جنگ کی شکار ہوگئیں۔ڈیوڈ کے گروپ نے شاہین صفت کبوتر مزاج نسل کے جذباتی سوچ کو استعمال میں لایا اور سفید کرگسوں کے ہمالیہ نما مضبوط ٹھکانوں کو آگ کے شعلوں میں تبدیل کروایا۔

دوسری جانب جوزی گروپ نے سفید کرگسوں کی بالا دست نفسیات کو بھڑکایا اور

انہیں شاہینوں سے بدلا لینے پر اُکسایا۔سفید کرگسوں نے شاہینوں کے چمنستانوں پر قیامت برپا کردی۔لاکھوں شاہینوں کے گرم گرم خون سے سارے چمنستان لال ہوتے چلے گئے۔ ہر ذہن پر خوف کے سائے منڈلانے لگے۔

مشن القدس چلانے والے چند برسوں تک اپنی کامیابی کے خواب دیکھتے رہے لیکن دھیرے دھیرے انہیں اپنے خواب سراب ہوتے دکھائی دینے لگے۔

دنیا کے یہ خونین مناظر ڈیوڈ کے ضمیر پر کوڑے برسانے لگے۔وہ دوسروں کے ساتھ ساتھ خود کو بھی اس حیوانی کھیل کا ذمہ دار ٹھہراتا رہا۔آخر کار اُس نے مشن القدس سے بغاوت کر کے انسانیت کا ساتھ دینا مناسب سمجھا۔وہ عالمی ایوانوں تک انسانیت کی آواز پہنچانے کا عزم کر کے اُٹھا اور دنیا میں امن وآشتی پھیلانے کی زوردار مہم شروع کی ،لیکن اندھیرا بہت بڑھ چکا تھا اور سفید کرگسوں نے ساری فضا میں ادھم مچا رکھی تھی۔مشن القدس نے شاہینوں کی بلند پروازی پر مثبت اثر ڈالا۔ان میں بکھراؤ کے بدلے اتحاد کی فضا پھیل گئی۔ان کی اڑانوں سے دنیا کا چپہ چپہ لرزنے لگا۔ان کی زوردار پروازوں سے مشن القدس کے سازشی ذہن نفسیاتی دباؤ کے شکار ہو گئے اور سفید کرگس بچاؤ کے راستے تلاش کرنے لگے۔

مشن امن کا چرچا ہر طرف ہو رہا تھا اور جدید دنیا کی ایک نئی تاریخ رقم ہو رہی تھی۔

مینٹل ہاسپٹل

آوارہ کتوں کی ہڑبونگ نے بستی میں دہشت پھیلا رکھی تھی۔ یہ کتے کسی بھی گلی، کسی بھی راستے پر بلاخوف انسانوں پر حملہ کر دیتے۔ دوسرے تیسرے روز کوئی نہ کوئی آدمی ان کی کاٹ سے ضرور زخمی ہو جاتا تھا۔ بستی کے بچوں پر ان آوارہ کتوں کا ڈر کچھ زیادہ ہی پڑا ہوا تھا۔ یہ ڈر یونہی نہیں تھا، چونکہ پچھلے کئی برسوں سے درجنوں بچے ان کتوں کے کاٹنے سے مر گئے تھے۔ لوگ میونسپلٹی والوں کو کئی بار اس مصیبت سے آگاہ کرتے رہے۔ وہ بھی میونسپلٹی کی گاڑی لے کر آجاتے اور ہاتھ لگے آٹھ دس کتوں کو لے جا کر کسی ویرانے میں ڈال جاتے۔ پھر چند روز کے بعد پکڑے گئے کتے دوبارہ بستی میں نمودار ہوتے اور اس انداز سے بستی کا دورہ کر جاتے جیسے کہ کہنہ مشق چور کو پولیس والوں نے چوری کے الزام سے باعزت رہا کیا ہو۔ برف پڑنے کے ساتھ ہی پتہ نہیں اس بے زبان مخلوق کی فطرت پر سردی کا کون سا زہریلا اثر پڑ جاتا اور اکثر کتے پاگل ہو جاتے۔ پاگل ہوتے ہی وہ بلاتفریق بچے

بوڑھوں کو کاٹنا شروع کر دیتے۔بستی کے لوگ ہاتھوں میں ڈنڈے اُٹھا کر ان پر حملہ کر دیتے اور وہ بے زبان چیوں چوں کرتے کرتے جان دے دیتے۔کئی مرتبہ بستی کے لوگوں نے میونسپلٹی اہلکاروں سے گزارش کی کہ ان آوارہ کتوں کو مارنے کی کوئی سبیل نکالیں لیکن میونسپلٹی اہلکار انکار کرتے ہوئے کہتے رہتے کہ قانونِ حیوانات کے مطابق کوئی بھی انسان کُتے کو مار نہیں سکتا ہے اور اگر کوئی یہ غلطی کر ڈالے گا تو اُسے جیل کی ہوا کھانا پڑے گی۔بستی کے لوگ جدید قانون کے اس انوکھے فیصلے کو سُن کر ششدر رہ جاتے کہ انسان آوارہ کتے کو مارے گا تو جیل اور نہ مارے گا تو خود اُس کی کاٹ سے مارا جائیگا۔لوگ پریشان تھے کہ کریں تو کیا کریں ......!بستی میں ایک دانا بزرگ رہتا تھا جو قدیم اور جدید علوم سے بھی آگاہ تھا۔اُس کی معاملہ فہمی اور دوراندیشی سے بستی کا ہر شخص متاثر تھا۔وہ بستی کے مشکل سے مشکل مسئلوں کو اپنی ذہانت کے بل پر آسانی کے ساتھ حل کر دیتا تھا۔لوگ مجبوراً اس تشویشناک مسئلے کو لے کر اُس کے پاس چلے گئے۔اُس نے تمام روداد سُن کر لوگوں کے سامنے ایک ایسی تجویز رکھی جس کو سُن کر لوگ فوراً مان گئے۔لوگوں نے بستی سے دور ایک گھنے جنگل میں ایک بہت بڑی سرائے بنا ڈالی۔یہ سرائے بنانے میں لوگوں کو کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی،چونکہ جنگل میں لکڑی وافر مقدار میں موجود تھی اسلئے چند ہی دنوں میں دیوار کی لکڑی سے ایک لمبی چوڑی سرائے تیار

ہوئی۔سرائے کا ایک حصّہ پاگل ہونے والے کتوں کے لئے رکھا گیا۔تمام کتوں کو ہانک ہانکا کر نئے گھر کی طرف دھکیلا گیا۔سرائے کے نزدیک ایک ندی بہتی تھی۔ بستی کے لوگوں نے ندی کے ساتھ ساتھ سرائے کے اردگرد ایک بڑی دیوار بھی کھڑی کر دی تا کہ کتے پھر سے بستی کی طرف نہ آسکیں۔میونسپلٹی کے اہلکار بھی یہ سُن کر خوش ہو گئے کیونکہ اُن کی پریشانی دور کرنے کا مناسب حل نکل آیا تھا۔انہوں نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈیپارٹمنٹ سے کتوں کے کھانے پینے کا انتظام کروایا۔ یہ اطلاع جب تحفظ حیوانات کے یورپین این،جی اوز کے کانوں تک پہنچی تو انہوں نے حیوان دوستی کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے سرائے کے پاس ہی ایک اسپتال بنوایا اور اپنے سوشل ورکر قابل رحم ڈاکٹرس کو وہاں پر تعینات کیا تا کہ وہ ان بے زبانوں کی دیکھ ریکھ کرتے ہوئے ان کے علاج معالجے کا بھی خیال رکھ سکیں۔بستی کے لوگوں نے بھی راحت کی سانس لی۔اب نہ کسی آدمی کو کتوں کی کاٹ سے کٹنے کا ڈر تھا اور نہ رات کے وقت نیند میں خلل اندازی کا کوئی اندیشہ تھا کیونکہ نہ کہیں کتا نظر آتا تھا اور نہ کہیں رات کے سایوں میں کسی کتے کے بھونکنے کی بےسُر آواز سنائی دیتی تھی۔

زندگی کا کارواں سُبک رفتاری سے چلتا رہا۔این،جی اوز کی کوئی نہ کوئی ٹیم کسی نہ کسی دن گاڑی میں سوار ہو کر بستی سے گزرتی ہوئی سرائے کی طرف چلی جاتی۔اسپتال کا

تعیناتی عملہ چھوٹے چھوٹے پلّوں کو دن بھر نہلاتا دھلاتا اور انہیں قسم قسم کے بسکٹس کھلاتا رہتا۔ بستی کے جو لوگ جنگل میں بھیڑ بکریوں کے ساتھ ہوتے تھے، وہ ان انگریزوں کی حیوان دوستی پر پہلے پہلے حیران پڑ جاتے لیکن آہستہ آہستہ اس حیرانی نے متاثر ہونے کا اثر شروع کر دیا۔ وہ جب شام کے وقت کسی جگہ اکٹھا ہو جاتے تو غیر شعوری طور پر دوسرے لوگوں کو بھی انگریزوں کے طور طریقوں سے آگاہ کرتے رہتے۔ اب اگر بستی کا کوئی فرد بیمار ہو جاتا تو این جی اوز کے اہلکار اُس کا مفت علاج کراتے رہتے۔ لوگوں کو ان کے یہ کام پسند آنے لگے۔ لوگوں کی پسند کو دیکھ کر این۔ جی۔ اوز نے پہلے بستی کے اندر ایک چھوٹا موٹا اسپتال کھولا جہاں پر مفت علاج کی سہولت دستیاب رکھی گئی۔ اس کے بعد لوگوں کی رضامندی سے ایک انگریزی اسکول بھی کھولا گیا۔ دھیرے دھیرے بستی کے اندر انگریزی اسکول کا چرچا ہونے لگا۔ بستی کے تعلیم یافتہ افراد نے جب اس نئے اسکول میں اپنے بچوں کو فخر کے ساتھ ایڈمیشن کروایا تو بستی کے ان پڑھ افراد بھی اپنے بچوں کو جدید تعلیم دلوانے کے لئے اسکول کی طرف رجوع کرنے لگے۔ این۔ جی۔ اوز نے بستی کے اقتصادی طور ناخیز افراد کے بچوں کے لئے مفت تعلیم دینے کا اعلان کروایا۔ اب بستی کے بیشتر بچے انگریزی اسکول میں تعلیم پانے لگے۔ بستی کے دانا بزرگ نے کئی مرتبہ بستی کے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اپنے بچوں کو ضرور جدید تعلیم

دینے کی کوشش کرو لیکن ساتھ ساتھ اخلاقی تعلیم سے بھی روشناس کراؤ اور اس انگریزی اسکول کے بدلے اپنا ایک اچھا اسکول کھولو۔ جہاں پر جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ اخلاقی تعلیم کا بھی انتظام ہونا چاہیئے تا کہ ہماری نئی نسل پڑھ لکھ کر انسانی خصائل سے بھی آراستہ ہو۔

وقت کی تیز رفتاری انسانی سوچ کو تیز رفتار بنا دیتی ہے۔ تیز رفتار گھوڑے کو بھاگتے بھاگتے جب اچانک ٹھوکر لگتی ہے تو وہ ایسے زمین پر دھڑام سے گرتا ہے کہ پھر وہ منزل کی طرف آہستہ آہستہ چلنے کے قابل بھی نہیں رہتا ہے۔ بستی کے دانا بزرگ کی حکمت آمیز باتوں کی طرف لوگوں نے کوئی دھیان نہیں دیا۔ کوئی انہیں فرسودہ خیالات کہہ کے رد کرتا رہا اور کوئی انہیں جدید زمانے کی تیز رفتار ترقی میں رُکاوٹ کا مشورہ سمجھ بیٹھا۔ دانا بزرگ نہ قدیم خیالات کی وکالت کر رہا تھا نہ جدید تعلیم سے بیزار تھا وہ صرف انسانی قدروں کی پاسداری چاہتا تھا تا کہ انسان، انسان کی طرح زندگی گزار سکے۔ وہ خود انگریزی دنیا کا مشاہدہ کر چکا تھا۔ وہ ان کے ڈسپلن، فکر و تدبر، تعلیم و تربیت اور ترقی کے طور طریقوں کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتا تھا اور اپنے لوگوں میں یہ خصائل دیکھنے کا خواہشمند تھا لیکن اُسے اگر نفرت تھی تو انگریزوں کی مصنوعی سوچ سے، مادیت پرستی اور ان کی مکارانہ فکر سے۔ اُس کے ذہن میں حکیم الاّمت علامہ اقبال کا انگریزوں کی فطرت سے فرمایا ہوا یہ پُر حکمت

مصرع ہمیشہ رہتا تھا۔

''پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات''

بستی کے لوگ انگریزی اسکول کی صاف ستھرائی، ڈسپلن، تعلیم اور بول چال سے متاثر ہوتے رہے۔ یہ چیزیں یقیناً قابل ستائش تھیں کیونکہ انسان کو صاف ستھرائی، ڈسپلن اور تعلیم کے نور سے ضرور آراستہ ہونا چاہئے۔ بستی کے اکثر بچے انگریزی اسکول میں تعلیم پاتے رہے۔ امتحانات میں اچھی کارکردگی دکھاتے رہے۔ سمیناروں میں حصّہ لے کر بڑے بولڈ بنتے گئے۔ ہائر ایجوکیشن کے لئے انہیں مغربی ممالک بھیجا گیا۔ وہ بڑی بڑی ڈگریاں لے کر واپس آتے گئے۔ بستی کے قدیم ماحول میں جدید ہوائیں چلنے لگیں۔ بستی کے بیشتر گھروں میں جدید سہولیات کی تمام چیزیں پہنچ گئیں۔ گھر گھر میں ڈش ٹی وی، انٹرنیٹ اور موبائیل کی دُھنیں بجنے لگیں۔ صبح کے وقت اخلاقیات کی کتابوں کے بجائے انٹرنیٹ اور ڈش ٹی وی کے فحاش مناظر کی طرف ذہن راغب ہوتے گئے۔ اب اسپتالوں میں خراب گردے کے ساتھ ساتھ اچھے گردے بھی غائب ہونے لگے۔ دفتروں میں پاگل کتوں کے نوکیلے دانتوں سے لوگ زخمی ہونے لگے۔ رات کے وقت گلی کوچوں میں نشہ آور حیوان شکار کی تاک میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھومنے لگے۔ باحیاء عورتوں کا گھر سے نکلنا دوبھر ہو گیا۔ نئی نسل کے ذہنوں پر صرف مادیت کا بھوت

سوار تھا۔ دنیوی زندگی کو حتمی زندگی سمجھنے کا تصور پھیل چکا تھا اور آخرت کی زندگی کو دیوانے کا خواب کہہ کر رد کیا جا رہا تھا۔ انسانی رشتوں کا تصور ختم ہونے لگا۔ نیکی اور بدی کے درمیان کوئی فرق نہ رہا۔ عبادت گاہوں کی طرف چند بزرگ کمر جُھکائے ہوئے جاتے نظر آ رہے تھے۔ ہر طرف آپا دھاپی کا عالم تھا۔

نئی نسل کی طوفانی زندگی کے زہریلے تھپیڑوں سے بزرگوں کے دل دہلنے لگے۔ نئی نسل کی دین بیزاری، بے راہ روی، خود غرضی اور سانپوں والی فطرت سے خوف زدہ ہو کر بستی کے بزرگوں نے جب احتجاج کرنا چاہا تو انہیں یہ سُن کر اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا کہ انہوں نے آنکھیں بند کر کے جن بچوں کو مغربیتکی سونامی میں پھینکا تھا وہ آج انہیں اپنے ہی گھروں سے بے گھر کر کے برسوں پرانی بنائی ہوئی کتوں کی سرائے کو اولڈ ایج ہاؤس بنانے کا اعزاز دے کر بے یار و مددگار بھیجنا چاہتے ہیں۔

بستی کے لوگ بظاہر خوشحال دکھائی دے رہے تھے۔ لیکن ان کے دل اندر ہی اندر ٹوٹ چکے تھے۔ مادی چیزوں کی فراوانی کے باوجود روحانی سکون کا جنازہ نکل چکا تھا۔ بزرگ اس طوفان سے آزاد ہونا چاہتے تھے۔ بہت ساری ترکیبیں جب ناکام ثابت ہوئیں تو وہ بالآخر لاچار ہو کر بڑی شرمندگی کے ساتھ بستی کے دانا بزرگ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ بزرگ نے جب ان لوگوں کی دردناک

داستان سُنی تو وہ آنکھیں بند کر کے برسوں پہلے کے اُس دہشت ناک حادثہ میں کھو گیا جب بستی کے اندر آوارہ کتوں نے ہڑ بونگ مچا رکھی تھی اور کسی بھی راہ چلتے انسان کو اپنے نوکیلے دانتوں سے کاٹ کھاتے تھے۔

ہر انسان بڑی بے قراری کے ساتھ دانا بزرگ کے حکمت بھرے مشورے کا انتظار کر رہا تھا۔لوگوں کے چہرے پر خوف کی ہوائیں اُڑ رہی تھیں۔ بزرگ نے آنکھیں کھولتے ہوئے ان لوگوں کے سامنے ایک حکمت بھری تجویز رکھی اور انہیں اس تجویز پر جلد عمل کرنے کی تلقین کرتے ہوئے رخصت کر دیا۔

لوگوں کے ذہنوں میں انتشار کے بجائے سکون نے جگہ پائی اور ان کے دلوں میں وسواس کے بجائے یقین کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔صبح ہوتے ہی لوگ کالے لباس میں سفید جھنڈے اُٹھاتے ہوئے انگریزی اسکول کی طرف طوفان بن کر دوڑ پڑے۔این-جی-اوز کے تمام اہلکار راتوں رات بھاگ گئے تھے۔اسکول کے اوپر سبز جھنڈا چڑھایا گیا۔انگریزی تہذیب کی پروردہ نسل خوف زدہ ہوکر بھاگنے کی کوشش کرنے لگی۔انہیں مشرقی تہذیب کی دلدادہ نسل نے رسیوں سے باندھ کر سرائے کی طرف گھسیٹا، پھاٹک کھولتے ہی بند سرائے کے کُتے بستی کی جانب دوڑ پڑے۔سرائے کے اوپر ایک بہت بڑا بورڈ لٹکایا گیا جس پر جلی حروف سے لکھا ہوا تھا......مینٹل ہاسپٹل۔

دوشالہ

خوجہ کاک کی اُمیدوں پر جیسے اُوس پڑی ہوئی تھی۔ ریشم خانہ چلانے کے لئے ایک تجربہ کار کاریگر کی ضرورت ہوتی ہے اور کوئی ڈھنگ کا کاریگر نہ ملنا خوجہ کاک کے لئے سوہان روح ثابت ہو رہا تھا۔ اُس کی حسرت بھری آنکھیں کارخانے کی بے کار مشینوں کو تکتے تکتے پتھرا سی گئی تھیں۔ چار کمروں والا معمولی سا مکان تک گروی رکھ کر اُس نے بنک سے جو قرضہ لیا تھا' سال بھر بیت جانے کے باوجود بھی وہ بنک کے قرضہ کا ایک فیصد بھی ادا نہ کر پایا تھا۔ دوسرے مل مالکوں کی کامیابی کے مقابلے میں اپنی تجارت کی ناکامی نے اُس کے ذہن میں ایک ایسا تناؤ پیدا کیا تھا کہ وہ اکثر بیوی بچوں کے ساتھ فضول میں لڑتا جھگڑتا اور کبھی کبھی خودکشی کرنے کے بُرے خیالات بھی اُس کی سوچ کو گھیر لیتے۔ جو بھی بیوپاری ایک مرتبہ اُس کے کارخانے سے مال خرید لیتا تو نفع کے برعکس نقصان اُٹھانے کی وجہ سے وہ دوبارہ اُس کے کارخانے کا منہ تک دیکھنا گوارا نہ کرتا۔ کافی عرصہ بیت جانے کے بعد

جب ایک دن بنک کے کرمچاری پولیس لے کر خوجہ کاک کے گھر میں نمودار ہوئے اور اُسے بیوی بچوں سمیت گھر سے بے دخل کرنے لگے تو یہ خبر سنتے ہی بستی کے لوگ وہاں پر جمع ہو گئے۔ کافی منت سماجت کرنے کے بعد بستی کا ایک غریب ہمدرد شخص ریشم چاچا بنک کرمچاریوں سے چند مہینے کی مہلت مانگنے پر راضی کر گیا۔ آفت تو ٹل گئی لیکن خوجہ کاک گھر کی دہلیز پر غمگین صورت بنائے سر جھکا کر اپنی قسمت کو کوسنے لگا۔ ریشم چاچا اُس کی ہمت باندھے ہوئے اُسے ہاتھ پکڑ کر کارخانے کی جانب لے گیا۔ ریشم چاچا کارخانے کا بغور مشاہدہ کر کے بول پڑا۔

''خوجہ کاکہ! آپ نے فضول میں پریشانی کو گلے لگایا ہے' خدا پر بھروسہ رکھو وہ سب کچھ ٹھیک کر دے گا۔''

''بھروسہ تو خدا پر ہی ہے'' خوجہ کاک سرد آہ بھرتے ہوئے بول پڑا ''لیکن کارخانے کی ناکامی نے مجھے کہیں کا نہ رکھ چھوڑا۔''

''کوئی بات نہیں'' ریشم چاچا اُس کے کندھوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہنے لگا ''اگر خدا نے چاہا تو تیرا کارخانہ دن دُگنی رات چُوگنی ترقی کرے گا۔''

''لیکن وہ کیسے...؟'' خوجہ کاک ریشم چاچا کا منہ تکتے ہوئے پوچھ بیٹھا۔

''تم صرف ایک کام کرو'' ریشم چاچا اُسے دلاسہ دیتے ہوئے بول پڑا۔ ''کل کارخانے کی صفائی سُتھرائی کرانا اور دس دنوں تک ریشم منگوا لینا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن......!''

''میں تیری بات سمجھتا ہوں۔'' ریشم چاچا نے بیچ میں بولتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا کارخانہ میں چلاؤں گا۔''

یہ غیر متوقع خوشخبری سنتے ہی خوجہ کاک کے چہرے پر بشاشت پھیل گئی اور اُس نے یہ کہتے ہوئے ریشم چاچا کو گلے لگایا کہ تمہارا یہ احسان میں زندگی بھر نہیں بھول پاؤں گا۔''

ریشم چاچا ریشمی دوشالے بننے کا ایک تجربہ کار کاریگر تھا۔ یہ ریشمی دوشالے بنانے میں اتنا ماہر تھا کہ لوگ اُسے اُس کے اصلی نام کے بجائے ریشم چاچا کے نام سے ہی یاد کیا کرتے تھے۔ خوجہ کاک نے اگرچہ کئی مرتبہ ریشم چاچا سے کہا بھی تھا کہ وہ اگر اُس کے کارخانے میں کام کرے گا تو وہ اُسے دُگنی تنخواہ دے گا' لیکن ریشم چاچا یہ کہہ کر ہمیشہ انکار کرتا رہتا کہ وہ اپنے مالک کے ساتھ چند پیسوں کے بدلے دھوکہ نہیں کرسکتا۔ برسوں سے وہ جس آدمی کا کارخانہ سنبھالتا آیا ہے وہ اُس کا بھروسہ نہیں توڑسکتا۔

ریشم کے دوشالے بنانے میں ریشم چاچا کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ یہ اُس کا خاندانی پیشہ تھا۔ جن لوگوں کے ہاں بھی اُس نے کام کیا تھا۔ ان کے گھروں میں ریشم چاچا کی کاریگری سے چاندی ہی چاندی دکھائی دے رہی تھی۔ لیکن ریشم چاچا کی قسمت

میں دوسرے سینکڑوں کاریگروں کی طرح دووقت کی روٹی کے سوا کچھ نہ لکھا ہوا تھا۔ریشم چاچا جس بستی میں رہتا تھا وہاں کے سب لوگ ریشم کے کارخانوں میں کام کرتے تھے۔اسی مناسب سے اُس بستی کا نام ریشم آباد پڑا تھا۔بستی صرف ریشم آباد نام کی تھی؛ اصل میں وہاں غریبی اور ناداری کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔یہ لوگ مہد سے لے کر لحد تک ان کارخانوں میں محنت مزدوری کرتے رہتے اور اس کا معاوضہ بس اتنا تھا کہ گھر کا چولہا ٹھنڈا ہونے سے بچ جاتا۔دوسری جانب فیکٹریوں کے مالک ان لوگوں کی محنت کے بل پر عیش وعشرت کی زندگی گزارتے رہتے۔

چند دنوں کے بعد ریشم چاچا نے خوجہ کاک کے کارخانے کا کام سنبھال لیا۔اُس کے کام سنبھالتے ہی خوجہ کاک کی قسمت چمک اُٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے مال اتنا بکنے لگا کہ جو لوگ کل تک خوجہ کاک کے مِل کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے وہی اب مال کے لئے ایڈوانس بکنگ کروانے لگے۔خوجہ کاک کے گھر میں دولت کی ریل پیل اتنی بڑھ گئی کہ بنک کا سارا قرضہ سود سمیت ادا کرنے کے علاوہ وہ ایک بڑی جائیداد کا بھی مالک بن گیا۔لوگ بڑی حیرانی کے ساتھ ایک دوسرے کے سامنے اُس کی دولت وحشمت کا تذکرہ کرنے لگے۔

خوجہ کاک ایک شاندار گاڑی میں مِل کی طرف جاتا تھا اور ریشم چاچا کے ساتھ دن

بھر کے تجارتی معاملات پر صلح مشورہ کرتا رہتا۔ ایک دن اُس نے ریشم چاچا کو دوعدد ریشمی شال بنانے کے لئے کہا۔ شال بنانے کے بعد جب ریشم چاچا نے اُس کی خدمت میں پیش کئے تو خوجہ کاک نے ایک شال ریشم چاچا کو دیتے ہوئے کہا کہ یہ تم اپنی بیٹی کے لئے رکھنا، شادی کے دن کام آئیگا۔ ریشم چاچا حیرانی اور خوشی کے ملے جُلے تاثرات کے ساتھ کہنے لگا۔

''خوجہ صاحب! یہ قیمتی شال ہے میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔''

''آپ مجھے شرمندہ کررہے ہیں۔'' خواجہ کاک اپنائیت کے لہجے میں کہنے لگا۔ ''آپ کی بیٹی مجھے اپنی بیٹی جیسی ہے اور کارخانے کے اصل مالک تو آپ ہیں۔''

بہرحال ریشم چاچا آگے کچھ نہ بول سکا اور وہ شال لیکر گھر چلا گیا۔ کئی برسوں تک کارخانے میں کام کرتے کرتے ریشم چاچا کے آنکھوں کی بینائی میں فرق آنے لگا تھا۔ ایک دن جب وہ کپڑے بننے کی مشین چلا رہا تھا تو اچانک اُس کا ہاتھ مشین کی زد میں آ کر کٹ گیا۔ کئی مہینوں تک اسپتال میں ایڈمٹ رہنے کے باوجود بھی وہ ٹھیک نہ ہوسکا۔ روز بروز جب وہ کمزور ہوتا چلا گیا تو ایک دن ڈاکٹروں نے اُس کی بچی سے کہا کہ وہ کسی بھی طرح پچاس ہزار روپے کا انتظام کرے تاکہ ریشم چاچا کا آپریشن ہوسکے۔ بیٹی کو پریشان دیکھ کر ریشم چاچا نے اُسے خوجہ کاک کے پاس بھیجا۔

''بیٹی کیسے آنا ہوا؟'' خوجہ کاک نے پوچھا۔

''خوجہ کاکہ''! ریشم چاچا کی بیٹی آنسو بہاتے بہاتے بول پڑی۔'' بابا کا آپریشن کروانا ہے اس کے لئے پچاس ہزار روپے درکار ہے۔''

''پچاس ہزار'' خوجہ کاک حیرانی کے ساتھ بول پڑا۔'' دیکھو بیٹی! یہ تو بڑی رقم ہے۔اوپر سے اپنی بچی کی شادی کے دن بھی قریب آرہے ہیں۔جس پر بہت سے پیسے صرف ہو رہے ہیں۔''

''خوجہ کاکہ'' ریشم چاچا کی بیٹی منت سماجت کرنے لگی۔'' آپ کے بغیر ہم کس کے پاس جا سکتے ہیں۔ڈاکٹر کہہ رہے تھے کہ اگر جلدی آپریشن نہ ہوا تو بابا کی جان کو خطرہ ہے۔''

''اس وقت پیسوں کا انتظام نہیں ہو سکتا ہے۔'' خوجہ کاک نے تند خُوئی سے جواب دیا'' البتہ بچی کی شادی کے بعد دیکھا جائے گا۔''

ریشم چاچا کی بیٹی ٹوٹے قدموں وہاں سے واپس لوٹی۔اسپتال پہنچ کر وہ بابا کے بیڈ کے پاس بیٹھ گئی۔ریشم چاچا کے پوچھنے پر جب اُس نے خوجہ کاک کی دل توڑنے والی بات بتائی تو ریشم چاچا نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا'' بیٹی! ہماری قسمت میں ریشم کی گانٹھ پڑی ہے۔''

ڈاکٹروں نے چیک اَپ کرنے کے بعد یہ کہتے ہوئے ریشم چاچا کو اسپتال سے

رخصت کر دیا کہ جب پیسوں کا انتظام ہو جائے گا تو اُسے دوبارہ ایڈمٹ کرانا۔ ریشم چاچا کے جسم میں انفکشن زہر کی طرح پھیلتا گیا اور چند دنوں تک اس زہر نے پھیلتے پھیلتے اُس کی زندگی کا خاتمہ کر ڈالا۔

خوجہ کاک کے گھر میں شادی کی تقریب بڑی دھوم دھام سے چل رہی تھی۔ سینکڑوں مہمان دعوت کا مزا اُڑا رہے تھے۔ دولہے کے استقبال کے لئے صحن میں قالین بچھائے جا رہے تھے۔ ریشم چاچا کی بیٹی بدحواسی کے عالم میں وہاں پہنچ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے قیمتی شال کو سینے سے لگائے رکھا تھا۔ آنسوؤں کی دھار سے قیمتی شال تر بتر ہو رہا تھا۔ اُسے خوجہ کاک کے محل نما مکان کے چمکتے رنگ و روغن میں اپنے باپ کے خون کی سُرخی نظر آ رہی تھی۔ خوجہ کاک اپنی بیٹی کو جہیز میں دینے والی دس لاکھ کی گاڑی کا سنگار کرانے میں مگن تھا۔ ریشم چاچا کی بیٹی رقت آمیز لہجے کے ساتھ خوجہ کاک کی گود میں ریشمی دوشالہ ڈالتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر بھیک مانگنے لگی۔

''اے امیر خوجہ کاک! مجھے اس ریشمی شال کے بدلے اپنے غریب بابا کے لئے کفن چاہئے۔''



وطن کی عصمت

وہ دونوں رات بھران وحشی درندوں کی درندگی کا شکار ہوتی رہیں۔وطن کے محافظ ہی راہزنی کا کھیل کھیلتے رہے۔وہ ان درندوں سے ہاتھ جوڑ کر......گڑگڑا کر رہائی کی فردیا کرتی رہیں،ان سنگ دل جلادوں سے رحم کی بھیک مانگتی رہیں کہ ''خدا کے لئے ہم پر رحم کھاؤ، ہمیں چھوڑ دو......وحشی مت بنو......تم وطن کے رکھوالے ہو، وطن کی عصمت پرڈاکہ مت ڈالو''۔لیکن ان معصوم کلیوں کی آہ وزاری سے کسی بھی درندے کا دل نہیں پگھلا۔ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ درندے مادر پدر آزاد قسم کے وحشی تھے۔اُن کی رگوں میں انسانی خون کے بدلے ہوس کی شراب دوڑ رہی تھی۔ ان دو معصوم کلیوں کو ڈیڑھ درجن درندے شب بھر مسلتے رہے اور اپنے آہنی پنجوں سے ان کے جسموں کو نوچتے رہے۔صبح کے وقت جب مسجدوں سے اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں تو ان دونوں کی سانسیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دی گئیں۔

ان دونوں کلیوں کا سانحہ، محکوم بستی کی مظلوم تاریخ کے درد بھرے اوراق کا ایک اور قابل رحم حصّہ بن گیا۔ آسیہ اور نیلوفر گاؤں سے دور اپنے باغیچے میں کسی کام سے گئی ہوئی تھیں۔ وہ ابھی باغیچے میں ہی تھیں کہ دن کا اُجالا رات کی کالی چادر اوڑھے جا رہا تھا۔ وہ دونوں گھر کی طرف نکل پڑیں۔ جونہی ندی پار کی تو سڑک پر انہوں نے ایک گاڑی دیکھی۔ چند ہی لمحوں کے اندر انہیں وردی پوش درندوں نے اپنے قابو میں لے لیا اور اپنے جرموں کے محفوظ اڈے پر پہنچا دیا۔ دونوں کو ایک کمرے میں بند کیا گیا۔ یہ وحشت ناک منظر دیکھ کر وہ دونوں سہم گئیں۔ آسیہ کالج کی طالبہ تھی اور نیلوفر اُس کی بھابی دو برس کے بچے کی ماں۔ دونوں خون کے آنسو بہا رہی تھیں۔ نیلوفر کا دل پارہ پارہ ہو رہا تھا جب وہ سوچتی کہ اس کے جگر کا پارہ دُودھ کے لئے تڑپ رہا ہوگا اور وہ مما مما چلاتا ہوگا۔ ایک گھنٹے کے بعد دو درندے جب کمرے میں داخل ہو گئے تو وہ دہشت کے مارے ہاتھ جوڑ کر ان کے پاؤں پڑیں اور آنسو بہاتے بہاتے ان سے اپنی رہائی کے لئے منت سماجت کرنے لگیں لیکن وہ درندے ان معصوم کلیوں پر حیوانوں کی طرح جھپٹ پڑے۔ یہ سلسلہ شب بھر چلتا رہا۔ یکے بعد دیگرے درندے اس وحشیانہ اور شیطانی فعل کا حصہ بنتے رہے۔ ان دونوں کا جسم اندر سے کٹ رہا تھا۔ وہ چیخ رہی تھیں لیکن وحشی درندوں کی پیاس نہیں بجھتی تھی۔ وہ بے ہوش ہوتی گئیں اور رات بھر ظلم کا شکار ہوتی رہیں۔ یہ رات

اُن کی زندگی کی آخری رات ثابت ہوئی۔

ظالم کتنا بھی ظلم کو چھپانے کی کوشش کرے بہرحال ظُلم کی چیخ ضرور سنائی دیتی ہے۔آسیہ اور نیلوفر کے قتل کی چیخ تمام وادی میں پھیل گئی اور ساری وادی سراپا احتجاج بن گئی۔چمن کے مالی نے اسے ایک حادثہ قرار دیا لیکن جب احتجاج کی آگ پھیلتی گئی تو اُس طفل دبستان مالی نے اپنے بیان سے توبہ کرلی اور لوگوں سے معافی مانگتے ہوئے اسے ایک سانحہ کے طور پر قبول کرنے پر مجبور ہوگیا۔لوگوں کا جوش ٹھنڈا کرنے کے لئے ایک انکوائری کمیشن تشکیل دیا گیا جس نے بیالیس دنوں کے بعد اپنی رپورٹ میں اس سانحہ کی جان ہی نکال دی۔مجرموں کو عوام کے سامنے بے نقاب کرنے کے بجائے قتل کی گئی دونوں لڑکیوں کے کردار کو داغدار بنانے اور انصاف کے طالب ان کے گھر والوں کو اس قتل کے ذمہ دار ٹھہرانے کی کوشش کی گئی۔

آسیہ اور نیلوفر کی مظلوم روحیں انصاف کا انتظار کررہی ہیں اور اُن کی چیختی عصمتیں رات کے بھیانک سائے پھیلتے ہی چلا چلا کر وادی کے ہر انسان سے فریاد کررہی ہیں۔ان کی غیرت کو للکار رہی ہیں کہ اٹھو ان قاتلوں سے ہمارا بدلہ لو......کب تک تم اپنی ماؤں، بہنوں اور بیٹوں کی عصمتوں کو تار تار ہوتے ہوئے دیکھو گے......

اُٹھو،اپنی آواز اُٹھاؤ......ان ظالموں کے خلاف......ان جابروں کے خلاف اور

اپنے وطن کی عصمت......اپنی وادی کی عصمت کو بچاؤ۔ ؎

آئے زندگی نہ گزرنا ہماری گلیوں سے
ابھی ہمارے جنازے گھروں میں رکھے ہیں
(نسرین نقاش)



رحمت کے پھول

رئیس خان کے گھر سے جب چیخ و پکار کی آواز اُٹھی تو پاس پڑوس کے لوگ اس کے گھر کی جانب دوڑ پڑے۔ سلیم خان اپنی بیوی کو بڑی بے رحمی سے پیٹ رہا تھا۔ دو معصوم بچیاں ماں کے ساتھ لپٹ کر رو رہی تھیں۔ رئیس خان نے سلیم خان کے ہاتھ سے ڈنڈا چھین لیا اور اُسے دھکے مار مار کر کمرے سے باہر کر دیا۔ ایسے واقعات اس گھر میں کبھی نہ کبھی رونما ہوتے رہتے تھے اور اس تعلق سے افراد خانہ کے درمیان کبھی کبھار تلخ کلامی بھی ہو جاتی تھی۔ گھر کا امن و سکون افراد خانہ کے آپسی پیار و محبت سے ہی قائم رہ سکتا ہے اور جب سوچ میں بگاڑ آ جائے تو نہ صرف امن و سکون کے خوشحال محل میں ویرانی چھا جاتی ہے بلکہ گھر کی عزت بھی تماشا بن جاتی ہے۔

سلیم خان اور شکیلہ کی شادی کے سات برس مکمل ہو رہے تھے۔ سلیم خان نے گریجویشن کے بعد تجارت کا پیشہ اپنایا تھا اور مقامی مارکیٹ میں اپنا ایک کلاتھ

شاپ کھولا تھا۔ پہلے پہل اُسے بہت ساری مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ ہمت نہیں ہار بیٹھا۔ چند برسوں کے اندر اندر اس کی محنت رنگ لائی اور دکان کا کام اتنا بڑھ گیا کہ اُسے پل بھر بیٹھنے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ شکیلہ کے آنے سے ان کے گھر کی خوشیاں دوبالا ہو گئیں۔ وہ اگرچہ میٹرک پاس ہی تھی لیکن گھر گرہستی سنبھالنے میں ایسی سلیقہ شعار کہ گھر کی خوشحالی میں چار چاند لگ گئے۔ وہ تمام گھر والوں کے ساتھ بڑے مہذبانہ انداز اور شگفتہ روی سے پیش آتی تھی۔ اپنے ساس سُسر کی خدمت وہ جس اپنائیت اور خوش اسلوبی سے انجام دیتی تھی وہ خویش و اقارب میں مثال بن گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ساس سُسر اُسے بہو کی بجائے بیٹی کہنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ چند برس بڑے خوش و خرم سے گزر گئے۔ میاں بیوی کے درمیان کبھی بھی کوئی ناخوشگوار واقع پیش نہیں آیا۔ لیکن رفتہ رفتہ دونوں کی مٹھاس بھری زندگی میں کڑواہٹ آنے لگی۔ کڑواہٹ کا سبب ان کی دو معصوم لڑکیاں تھیں۔ شکیلہ کا پاؤں پھر سے بھاری تھا۔ گھر کے کام کاج میں اگرچہ اُس کی ساس اس کا ہاتھ بٹاتی رہتی تھی لیکن شکیلہ کے ذہن پر ہمیشہ ایک انجانے خوف کا سایہ چھایا رہتا تھا اور وہ خوف تھا تیسری اولاد کا! ۔ وہ سوچتی رہتی کہ اگر اس بار بھی لڑکی کا جنم ہوا تو کیا معلوم اُس کا خاوند اُس کے حق میں کیا فیصلہ سنا دے گا۔ وہ یہ بات تو خود سمجھتی تھی کہ لڑکی یا لڑکے کا جنم نہ اُس کے بس میں ہے اور نہ اُس کے

خاوند کے بس میں، یہ پھل تو اوپر والے کے فیصلے کے مطابق دنیا میں آتے ہیں لیکن اُس کا خاوند لڑکے کی تمنا میں ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا۔لڑکے کا بھوت اس کے ذہن پر ایسے سوار ہوا تھا کہ وہ معمولی بات پر بھی شکیلہ کو یہ کہتے ہوئے زدکوب کرنا شروع کر دیتا کہ ''تمہارے اندر لڑکا پیدا کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے اس لئے تمہاری گود میں سے صرف لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں، تم میں ضرور کوئی کھوٹ ہے۔''

ایک رات جب سلیم خان دکان سے گھر لوٹا تو شکیلہ نے کھانا اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا کہ کل اُسے میکے چلے جانا ہے۔''تجھے کون جانے سے منع کر رہا ہے۔'' سلیم خان طنز کرتے ہوئے بولا''جاو! اور ایک مصیبت ساتھ لے کر آنا''۔

''مصیبت'' شکیلہ تُند لہجے میں بولی ''بیٹیوں کو مصیبت مت کہو۔کس والدین کو معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا نام بیٹا روشن کریگا یا بیٹی......؟'' یہ سنتے ہی سلیم خان کی رگِ حمیت پھڑک اُٹھی اور اُس نے ڈنڈا اُٹھا کر شکیلہ کو پیٹنا شروع کر دیا۔شور وغل سن کر گھر کے دوسرے لوگ بھی ان کے کمرے میں آ گئے اور سلیم خان کے ہاتھ سے ڈنڈا چھین لیا گیا۔سلیم خان غصے کی آگ میں جل بن رہا تھا اس کا والد رئیس خان جب کمرے کے اندر آیا تو بہو کے آنسو اُسے برداشت نہیں ہوئے۔طیش میں آ کر اُس نے سلیم خان کے منہ پر زوردار تھپڑ مارا۔

''جاہل انسان!......لڑکیاں بھی گھر کی زینت ہوتی ہیں۔اسلامی تعلیم کے مطابق

لڑکیوں کی اچھی پرورش انسان کو جہنم سے بچا سکتی ہے۔لڑکا یا لڑکی' دونوں خدا تعالیٰ کے عطا کردہ دو میٹھے پھل ہیں اور تم جیسے جاہل لوگ میٹھے پھلوں کے درمیان امتیاز کر کے اپنی نادانی کا ثبوت فراہم کرتے ہو۔''

باپ کی سرزنش سے سلیم خان کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا اُور وہ پشیمان ہو کر کمرے سے نکل گیا۔دوسرے دن سلیم خان باپ کی ہدایت کے مطابق شکیلہ کو سسُرال چھوڑنے چلا گیا۔شکیلہ ہمیشہ پریشان سی رہتی تھی۔وہ سوچتی رہتی کہ اگر پھر سے لڑکی کا جنم ہوا تو پتہ نہیں سلیم خان کیا کر بیٹھے گا۔اسی فکر نے اس کا بُرا حال کر دیا تھا۔لیکن شکیلہ کی پریشانی اس قت خوشی میں بدل گئی جب اس نے ایک لڑکے کو جنم دیا۔لڑکے کی خوشخبری سے دونوں گھرانے چہک اُٹھے۔چند مہینے بعد شکیلہ کی واپسی سے گھر کی خوشیاں دوچند ہو گئیں۔سلیم خان نے اپنے بیٹے کا نام ظفر یعنی کامیابی رکھا۔گھر میں اب شانتی ہی شانتی نظر آ رہی تھی۔سلیم خان ہر وقت خوشی سے جھومتا رہتا اور دکان سے گھر لوٹنے کے بعد بچوں سے ایسے گھل مل جاتا کہ شکیلہ اسے کبھی کبھی از راہ مذاق چھیڑا بھی کرتی کہ زیادہ لاڈ پیار سے بچے بگڑ جاتے ہیں اور سلیم خان بھی مسکرا کر کہتا رہتا''تم میرے بچوں کے پیار میں دخل مت دیا کرو۔''

اسکول جانے کی عمر میں سلیم خان نے ظفر کا ایڈمیشن شہر کے ایک مشہور اسکول میں کروایا۔وقت گزرتا رہا۔لڑکیاں جی لگا کر پڑھتی رہیں لیکن ظفر پڑھائی کی طرف کم

ہی دھیان دیتا رہتا۔عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کا چال چلن بھی بگڑتا گیا۔سلیم خان نے اسے ہر قسم کی سہولت میسر رکھی تھی۔گھر میں کمپیوٹر اور گھومنے پھرنے کے لئے شاندار گاڑی، لیکن اس سب کے باوجود وہ پڑھائی کے بجائے آوارہ گردی کرنے میں وقت گزارتا رہتا۔کئی بار یار دوستوں نے سلیم خان کو ظفر کے بُرے عادات کے بارے میں بتایا بھی لیکن وہ ہمیشہ یہ کہہ کر بات ٹالتا رہا کہ وقت آنے پر بچہ خود سنبھل جائے گا۔شکیلہ بھی اُسے وقتاً فوقتاً ظفر کی آوارہ گردی کے متعلق کہتی رہتی اور وہ یہ کہہ کر اُسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیتا کہ تم بیٹیوں کی طرف دھیان رکھو، ظفر تو لڑکا ہے اس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

لیکن بدلتے وقت کے ساتھ سلیم خان کو بھی ظفر کے بگڑتے چال چلن سے تشویش ہونے لگی۔اس نے ظفر کو بہت بار سمجھایا بھی کہ وہ اپنے آپ کو سدھارے اور پڑھائی کی طرف دھیان دے لیکن ظفر تھا کہ اپنی مستی کے عالم میں مست۔وہ نہ صرف اسکول میں غنڈہ گردی کرتا رہا بلکہ اب وہ لڑکیوں کو بھی چھیڑنے سے عار محسوس نہ کرتا تھا۔

سلیم خان کی بڑی لڑکی نے ایم اے کے امتحان میں اوّل پوزیشن حاصل کی تھی اور یونیورسٹی کی طرف سے اُسے گولڈ میڈل ملنے والا تھا۔گھر کے تمام لوگ خوش تھے۔ سلیم خان نے ظفر کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ ''تم بھی محنت کرو اور پڑھ لکھ کر کچھ اچھا

بن کے دکھاؤ۔''

''میں کیا پڑھتا نہیں ہوں'' ظفر نے غصے میں کہا۔

''پڑھتا تو تو بھی ہے میرے لال'' ماں نے اُسے بوسہ دیتے ہوئے کہا ''لیکن بہنوں کی طرح محنت کر و تا کہ تو بھی ہمارا نام روشن کر سکے۔''

تمام لوگ اس دن کا انتظار بڑی بے تابی سے کر رہے تھے اور ان کا انتظار اُس دن ختم ہو ہی گیا جب ان کی ذہین اور باکردار بیٹی گولڈ میڈل لے کر بڑی شان سے گھر میں داخل ہوگئی۔ سارا گھر خوشی سے جھوم اُٹھا اور سلیم خان کے گھر میں مبارک باد دینے والے لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ سلیم خان اپنی بیٹی کی صلاحیتوں کے گُن گا تا رہا اور شکریہ کے الفاظ زبان سے ادا کرتا گیا۔ گھر میں ابھی خوشی کی چہل پہل جاری تھی کہ شام کے وقت سلیم خان کے گھر پر اچانک پولیس نمودار ہوئی اور ظفر کے بارے میں پوچھ تاچھ کرنے لگی۔ سلیم خان نے جب ظفر کو آواز دے کر بُلایا تو پولیس اُسے ایک لڑکی کے قتل کے الزام میں گرفتار کر کے لے گئے۔ غم کی کڑواہٹ نے خوشی کی مٹھاس کو چوس لیا۔ سارا گھر ماتم کدہ بن گیا۔ سلیم خان نے آنسو بہاتے ہوئے دونوں بیٹیوں کو گلے لگاتے ہوئے بڑے دردناک لہجے میں کہا'' آج میں زندگی کے بڑے فریب کو سمجھنے میں کامیاب ہو گیا۔ بے شک لڑکیاں رحمت کے پھول ہوتی ہیں۔''

گلہ قصائی

منحوس چہرے پر نظر پڑتے ہی گُلہ قصائی کے تن بدن میں آگ سی دہک اٹھتی اور وہ سامنے پڑے لکڑی کے تختے پر موجود گوشت کو تیز دھار چاقو سے بوٹی بوٹی کر ڈالتا۔

گُلہ قصائی کا یہ حیرت خیز عمل کئی مہینوں سے جاری تھا۔اس کی دکان کے سامنے چاہیے خریدار ہو یا نہ ہو پھر بھی منحوس چہرے کو دیکھتے ہی اس کے ہاتھ خود بخود چاقو تھام لیتے اور اندھا دُھند گوشت کاٹنا شروع کر دیتے۔نفرت انگیز غصے سے اُس کی آنکھیں لال پیلی ہو جاتیں اور گالوں پر سُرخی پھیل جاتی۔کبھی کبھی کوئی خریدار گُلہ قصائی کی بدلتی رہتی عجیب وغریب کیفیت سے تھوڑا سا حیران ہو جاتا۔

گُلہ قصائی کی دکان سرکاری اسپتال کے مین گیٹ پر تھی۔جوانی سے لیکر اب اس ادھیڑ عمر میں بھی وہ بڑی سرعت سے اپنا کام کرتا رہتا۔اُس کی خوش اخلاقی اور ایمانداری نے خریداروں کے دل جیت لئے تھے۔وہ ہر کسی کے ساتھ بڑی عزت سے پیش آتا لیکن ڈاکٹروں کی عزت کرنے میں وہ کچھ زیادہ ہی فراخ دل ثابت

ہوا تھا۔ جب بھی کسی ڈاکٹر کی گاڑی گیٹ سے آتی جاتی تو اُس کا ہاتھ سلام کرنے کے لئے فوراً اٹھ جاتا اور جب بھی کوئی ڈاکٹر گوشت خریدنے آتا تو گُلہ قصائی گوشت تولنے کے بعد ایک دو ٹکڑے لفافے مین زیادہ ڈال دیتا۔ ڈاکٹر لوگ جب گُلہ قصائی کی دریا دلی کی تعریف کرتے تو وہ مسکرتے ہوئے کہہ اٹھتا کہ ڈاکٹر کا پیشہ مسیحائی کا پیشہ ہوتا ہے۔ آپ لوگ نہ صرف عوام کی خدمت کرتے رہتے ہیں بلکہ ان کے دُکھ درد کا علاج کر کے انھیں تکلیف سے بھی نجات دلاتے ہیں اور یہ کہتے ہوئے وہ اپنی زندگی کا ایک یادگار واقعہ انھیں ضرور سناتا کہ برسوں پہلے جب اس کی بیوی دردزہ کی حالت میں اسی اسپتال میں ایڈمٹ ہوئی تھی تو ڈاکٹر مشتاق صاحب رات بھر اُس کے علاج معالجے میں جٹے رہے اور صبح کے وقت اُسکا آپریشن کر کے ایک پھول سی بچی میری گود میں مسکراتے ہوئے ڈال دی تھی۔ میں نے شکریہ کرتے جب چند روپے انھیں دینے کی کوشش کی تھی تو اُس نے سخت ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں ایک سرکاری ملازم ہوں۔ مجھے سرکار آپ لوگوں کی خدمت کرنے کے لئے ہی تنخواہ دیتی ہے۔ جاؤ، ان پیسوں سے بچی کے لئے کپڑے لاؤ۔

وقت بدلتا رہا اور بدلتے وقت کے ساتھ ساتھ لوگوں کی سوچ بھی بدلتی گئی۔ انسانی دلوں میں انسانیت کے بدلے مادیت کا زہر پھوٹنے لگا۔ گُلہ قصائی کی بچی کا

پاؤں بھاری تھا۔ وہ دوپہر کے وقت دکان کے کام کاج میں لگا ہوا تھا۔ اُس کا چھوٹا بیٹا دوڑتے دوڑتے دکان پر آ کر کہنے لگا کہ ماں نے کہا ہے کہ بہن کی طبیعت کچھ خراب سی ہوگی ہے اس لئے جلدی گھر آ جاؤ۔ گُلہ قصائی دکان بند کر کے گھر کی جانب دوڑ پڑا اور بیٹی کو آٹو میں لا کر اسپتال میں ایڈمٹ کروایا۔

بیٹی دردزہ سے کراہ رہی تھیں لیکن گُلہ قصائی ڈاکٹر کے علاج سے مطمئن تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ ڈاکٹر کے ساتھ اُس کی علیک سلیک تو ہے ہی اس لئے پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ ایک آدھ گھنٹہ گزرنے کے بعد نرس نے گُلہ قصائی کے ہاتھ میں ایک پرچی تھما دی۔ گُلہ قصائی پرچی لیکر مارکیٹ میں دوائی کی دکان پر چلا گیا اور دوا فروش سے دوائی دینے کو کہا۔ دوا فروش گُلہ قصائی کا جان پہچان والا آدمی تھا۔ اُس نے پرچی دیکھ کر گُلہ قصائی سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب سے کہو کہ وہ دوسری کمپنی کا دوا لکھ کر دیں لیکن گُلہ قصائی کو یہ بات سمجھ نہیں آئی اور وہ دوا فروش سے جلدی جلدی دوا لیکر اسپتال کی جانب دوڑ پڑا۔ گُلہ قصائی وارڑ سے باہر بڑی بے قراری سے چہل قدمی کر رہا تھا۔ بیٹی کی کراہانے کی آوازیں اُس کے دل کو چھلنی کر رہی تھیں۔ اُس کی آبدیدہ نگاہیں بار بار اوپر کی جانب اٹھ رہی تھیں اور وہ سرد آہیں لیتے لیتے سرگوشی کے انداز میں دُعا مانگ رہا تھا کہ اللہ اُس کی بیٹی کو نظر رحمت سے نوازے۔ دن ڈھلتے ہی نرس نے گُلہ قصائی سے کہا کی ڈاکٹر کی کوشش کے باوجود

بھی آپ کی بیٹی کو کوئی راحت نہیں مل رہی ہے۔اب ڈاکٹر صاحب کی ڈیوٹی ختم ہورہی ہے۔اُس کو کلنک پر جانا ہے۔ آپ کے سامنے دو ہی راستے ہیں یا تو آپ کو اسی وقت شہر کے اسپتال جانا پڑے گا یا ڈاکٹر صاحب کے پرائیوٹ کلنک پر اسکا علاج ہوسکتا ہے۔جلدی مشورہ کرو نہیں تو دیر ہو جائے گی اور آپ کی بیٹی کو خطرہ بھی ہوسکتا ہے۔نرس کی باتیں سُن کر گُلہ قصائی پریشان ہو گیا۔بیوی سے مشورہ کر کے بیٹی کو کلنک میں ایڈمٹ کیا گیا۔نرس نے دوائی کی ایک اور پرچی تھماتے ہوئے گُلہ قصائی سے کہا کہ اسکا میجر آپریشن کرنا پڑیگا۔اس کے لئے تقریباً بیس ہزار کا انتظام کرنا ہوگا۔بیس ہزار کا نام سنتے ہی گُلہ قصائی سکتے میں آ گیا۔وہ سوچنے لگا کہ اتنی بڑی رقم کا انتظام کیسے ہوگا۔چند ہزار تو میں نے اس دن کے لئے سنبھال کر رکھے ہیں ان میں زیادہ تر خرچ ہو گئے۔گُلہ قصائی نے جب یہ بات بیوی کو بتائی تو اسکا سر بھی چکر کھانے لگا۔میاں بیوی ابھی اس بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ زندگی اور موت کی کشمکش میں جھول رہی بیٹی کے ہاتھ میں سونے کا کنگن دیکھ کر باپ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار نکل پڑی۔بیٹی کے ہاتھ سے سونے کا کنگن لیتے ہوئے گُلہ قصائی کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ جیسے آج اُس نے اپنے ہی گھر میں ڈاکہ ڈالا ہو۔مارکیٹ بند ہونے جا رہا تھا۔گُلہ قصائی نے ایک دکان پر چڑھ کر سنار کے سامنے کنگن رکھ دیا۔سُنار نے کنگن کا وزن کر کے گُلہ قصائی سے

کاروباری زبان میں کہا کہ سونے کا بھاؤ گر گیا ہے اور پھر بھی یہ استعمال شدہ سونا ہے اس لئے پندرہ ہزار سے زیادہ اس کی قیمت نہیں ہے۔ برحال گُلہ قصائی کے اصرار پر سُنار نے اُسے سولہ ہزار دے دئے اور گُلہ قصائی پیسے لیکر کلنک کی جانب بھاگتے ہوئے پہنچا۔ پیسے جمع کرنے کے بعد جب گُلہ قصائی ڈاکٹر کو لیکر کمرے میں داخل ہوا تو اپنی بیٹی کی آخری آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔۔۔۔بابا۔۔۔! گُلہ قصائی کے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ ہر طرف چیخنے چلانے کی آوازیں سن کر جیسے وہ بہرہ ہو گیا۔

گھر میں ماتم داری کے دن گزارنے کے بعد گُلہ قصائی دل پر پتھر رکھ کر دکان پر پھر سے بیٹھ گیا۔ وہ اب سرکاری اسپتال کو ذبیح خانہ کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اُس کا ہاتھ نہ کسی ڈاکٹر کو سلام کرنے کے لئے اٹھتا تھا اور نہ ہی وہ کسی ڈاکٹر کو ڈاکٹر مشتاق کی داستان سناتا تھا۔ اُس منحوس چہرے کی گاڑی جب گیٹ سے اندر چلی جاتی تو گُلہ قصائی کے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی اور وہ تیز دھار چاقو کو گوشت پر اندھا دُھند چلانا شروع کر دیتا۔

عید قربان کا تہوار تھا۔ عرفہ کی گہما گہمی سے بازار چمک رہا تھا۔ گُلہ قصائی کی دکان پر لوگوں کی بھیڑ لگی تھی۔ گُلہ قصائی گوشت کٹائی میں مصروف تھا کہ ایک مانوس آواز نے اُسے چونکا دیا۔ منحوس چہرے کو دیکھتے ہی گُلہ قصائی کی آنکھیں لال پیلی

ہوگئی۔ اُس کے ہاتھ تھرتھرانے لگے۔ ڈاکٹر مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ اُسے ایک کلو گوشت چاہیے وہ بھی بھیڑ کا' کیونکہ اُس کی بیٹی کا پاؤں بھاری ہے۔ پیسے دیتے ہوئے اُس نے مزید کہا کہ وہ اسپتال سے چھٹی کے بعد گوشت لے گا۔

''بیٹی کا پاؤں بھاری ہے'' والی آواز بار بار گُلہ قصائی کے کانوں سے ٹکراتی رہی۔ اس آواز نے اُسکے اندر ایک خوش گوار احساس جگا دیا۔ دکان کے کام سے فراغت پا کر وہ دوا فروش سے دوائی کی ایک شیشی لایا۔ شیشی کا ڈھکن کھول کر دوائی پانی میں ملا دی اور گوشت کو پانی میں بھگونے لگا۔ اُس کے ذہن میں عجیب و غریب قسم کے خیالات آتے رہے۔ وہ بڑی بے صبری سے ڈاکٹر کا انتظار کرتا رہا۔ آدھے گھنٹے کے بعد ڈاکٹر جونہی گوشت لینے کے لئے آیا تو اُس نے مسکراتے ہوئے ڈاکٹر کے ہاتھ میں گوشت بھرا لفافہ تھما دیا۔ ڈاکٹر پارک والی جگہ پر گاڑی کی طرف جانے لگا۔ گُلہ قصائی راحت کی سانس لیکر خیالات کے گہرے سمندر میں کھو گیا۔ ڈاکٹر نے جب گاڑی اسٹارٹ کی تو گُلہ قصائی کی آنکھوں کے سامنے عید کی خوشی کا منظر رقص کرنے لگا۔ اس کا ضمیر نیکی اور بدی کے بھنور میں ہچکولے کھانے لگا۔ ڈاکٹر کے سلوک سے بدی کا پلڑا بھاری ہوتا رہا۔ یہی وہ منحوس چہرہ تھا جس نے گُلہ قصائی کی انسانیت کے جذبے پر حیوانیت کا تیشہ چلایا تھا۔ ڈاکٹر کو گوشت دیکر اُسے یک گونہ سکون محسوس ہو رہا تھا۔ وہ ان ہی عجیب و غریب خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ مسجد

شریف سے اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی۔اللہ اکبر کی صدا سے گُلہ قصائی کو ایک جھٹکا سا لگا۔نیکی کا پلڑا بھاری ہونے لگا۔گُلہ قصائی کا ضمیر اسے کوسنے لگا کہ تو صرف قصائی ہے جلاد نہیں۔بیٹی کی ''بابا'' والی آواز پھر سے گُلہ قصائی کے کانوں سے ٹکرائی۔لیکن یہ آواز جلاد سے بدلہ لینے کے لئے نہیں بلکہ بیٹی کی جان بچانے کی آواز تھی۔گُلہ قصائی ننگے پاؤں گاڑی کی طرف دوڑ پڑا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر گوشت کا لفافہ اٹھاتے ہوئے بول پڑا ''یہ بکرے کا گوشت ہے بھیڑ کا نہیں۔''



تبصرے
تجزیئے

پیش لفظ

ریاست جموں وکشمیر میں افسانہ نگاری کی روایت کو تقسیم ملک کے بعد ایک نئی شکل وصورت مل گئی اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ نئے افسانہ نگاروں کی آمد سے یہ روایت مضبوط سے مضبوط تر چلی جارہی ہے ۔ اس وقت بھی یہاں ایسے افسانہ نگاروں کی کمی نہیں جو اس صنف کو ارتقاء بخشنے کے لئے اپنا رول خوش اسلوبی سے نبھا رہے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ آج یہاں کا افسانہ نگار عشقیہ کہانیوں سے دور ہو کر زمینی حقیقتوں کو اُجاگر کر رہا ہے، زمینی مسائل واضح کر رہا ہے۔ استحصال کی بد ترین صورتوں کے خلاف جنگ لڑ رہا ہے۔ وہ آج کے انسان کی پامالیوں کی بات کرتا ہے، خواتین کی عظمت اور بچوں کی معصومیت کو اپنے افسانوں کا پس منظر بنا کر ایک نئے افسانے کی تخلیق کر رہا ہے۔ وہ کھوئی ہوئی قدروں کی بازیافی کی خواہش رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ انسانی قدریں اپنا وجود کھو رہی ہیں، ہر سمت ہیجان اور انتشار بکھرا ہوا ہے۔ انسانی تہذیب وتمدن کا حاتمہ ہو رہا ہے۔ آج یہاں کا قلم کار زندگی کا زہر گھول گھول کر پی رہا ہے اور پھر بھی زندہ رہنے کی کوشش کر رہا ہے......اِس پس منظر میں کشمیر کے افسانوی ادب میں جو نئے نام سامنے آرہے ہیں ان میں ڈاکٹر ریاض توحیدی بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر ریاض توحیدی کا پہلا افسانہ ''قتل، قاتل اور مقتول'' کشمیر سے شائع

ہونے والے معروف اور مؤقر اخبار کشمیر عظمیٰ میں اپریل 2005 عیسوی میں شائع ہوا۔ تب سے وہ برابر کہانیاں لکھتے جا رہے ہیں اور اُن کی کہانیاں نہ صرف مقامی اخباروں بلکہ کشمیر اور بیرون کشمیر سے شائع ہونے والے رسائل میں بھی شائع ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر ریاض توحیدی اپنے افسانوں کا پہلا مجموعہ اپنے پڑھنے والوں کی نذر کر رہے ہیں، مجموعے کا عنوان ہے...... کالے پیڑوں کا جنگل...... بظاہر یہ عنوان کسی Abstract پینٹنگ کی طرح نظر آ رہا ہے لیکن مجموعے میں شامل کہانیاں پڑھ کر آپ کو اِس عنوان کی اہمیت کا اندازہ ہوگا۔ ڈاکٹر ریاض توحیدی نے اپنی تخلیقی سر گرمیوں کا آغاز اس وقت کیا جب کشمیر پرُ آشوب دور سے گذر رہا تھا، اس لئے ظاہر ہے کہ اس دور کے بہت سارے حالات، واقعات اور بہت ساری باتیں ان کے ذہن میں جگہ بنا گئیں اور جب انہیں افسانہ لکھنے کی تحریک ملی تو اس دور کی بہت سی باتیں اُن کے افسانوں میں ظاہر ہونے لگیں، یہی وجہ ہے کہ اُن کی اب تک کی تحریر کردہ اکثر کہانیوں میں درد و کرب، خون خرابہ اور ٹوٹتی ہوئی زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں ۔اس تعلق سے مجموعے میں شامل اُن کی کہانیاں قتل، قاتل اور مقتول، ناکہ بندی، ہوم لینڈ اور مسائل کے یزید قابل ذکر ہیں۔ ان کی اکثر کہانیوں کے کردار انسانی زندگی کی تلخیوں، الجھنوں اور ناکامیوں کی عکاسی کے ساتھ ساتھ بہتر اور خوشحال مستقبل کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ رنج و غم کی داستانوں میں وہ چراغ جَلا جَلا کر انسانی دلوں کی تاریکیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ آپسی بھائی چارہ پر روز دیتے ہیں......!

اُن کی ایک کہانی ہوم لینڈ سے ایک اقتباس......

''عبداللہ خان، سوم ناتھ اور سرجیت سنگھ ہندو مسلم اور سکھ اتحاد کی پائیدار علامت تھے۔ اِن لوگوں نے زندگی کی ستر بہاریں دیکھ لی تھیں، یہ ایک ہی گاؤں میں رہتے تھے اور زمانے کی نشیب وفراز میں یہ لوگ اتحاد و اتفاق کی ایک بے مثل علامت تھے۔ الگ الگ مذہبوں سے تعلق رکھنے کے باوجود یہ لوگ ایک ہی کنویں سے پانی پیتے تھے،ایک ہی کھیوٹ سے فصل اگاتے تھے۔ گاؤں میں ایک بہت بڑا صدیوں پرانا چنار تھا، یہ تینوں اس چنار کے سائے میں غم روزگار پر گفتگو کرتے رہتے تھے۔ یہ چنار اس علاقے کے لوگوں کا صدیوں پرانا ورثہ تھا جب بھی بستی میں بدامنی کا کوئی واقعہ پیش آتا تو بستی کے لوگ مِل جُل کر اس چنار کے سائے میں بیٹھ کر بدامنی کو امن میں تبدیل کرتے تھے۔''

(ہوم لینڈ)

کہانی کے تین کردار، تین فرقوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس کہانی میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کشمیر میں رہنے والے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان صدیوں سے چلے آرہے بھائی چارہ کو کیسے اور کن سازشوں کا شکار ہونا پڑا۔

ریاض توحیدی کا اصل نام ریاض احمد بٹ ہے لیکن وہ ریاض توحیدی کے نام سے لکھتے ہیں، وہ ضلع کپواڑہ کے تحصیل ہنڈوارہ کے ایک گاؤں وڑی پورہ میں یکم دسمبر 1973 عیسوی کو پیدا ہوئے۔ پہلی جماعت سے دسویں جماعت تک گورنمنٹ ہائی سکول وڑی پورہ میں تعلیم حاصل کی، انٹرمیڈیٹ کا امتحان گورنمنٹ ہائر سیکنڈری سکول ہنڈوارہ سے پاس کیا۔ گورنمنٹ ڈگری کالج ہندوارہ سے 1999 عیسوی میں بی،اے کیا۔ 2002 عیسوی میں کشمیر یونیورسٹی سے ایم،اے اردو کی ڈگری حاصل

کی ۔2004 عیسوی میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سے ایم فل کی ڈگری پائی۔ تحقیقی مقالہ کا موضوع تھا پروفیسر حامدی کاشمیری بحیثیت اقبال شناس اوراس کے بعد 2007 عیسوی میں پی،ایچ ،ڈی کی ڈگری حاصل کی۔موضوع تھا ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی اقبال شناسی۔ اِن دنوں بحیثیت لیکچرر محکمۂ تعلیم میں کام کر رہے ہیں۔

''کالے پیڑوں کا جنگل''میں اکیس کہانیاں شامل ہیں۔اپنے افسانوں میں وہ کبھی کبھار علامتوں کا بھی سہارا لیتے ہیں لیکن اِن علامتوں میں کوئی الجھاؤ محسوس نہیں ہوتا ہے......

> سفید ہاتھیوں کا یہ وحشی قافلہ عرصہ دراز سے اُن پر حملہ آور ہوا تھا۔ یہ درندہ صفت قافلہ اس جمادات نما مخلوق کو صفحۂ ہستی سے نیست ونابود کرنے پر تلا ہوا تھا۔ وہ بڑے غور سے سفید ہاتھیوں کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہورہا تھا کہ ان حملہ آور ہاتھیوں کے پیچھے قُقنُس کا مسحور کن ساز بج رہا ہے اور اِس ساز کی بدلتی رہتی آوازیں ان ہاتھیوں کی وحشیانہ سوچ پراثر انداز ہورہی ہیں،ان کے وحشیانہ جذبات کو بھڑکا رہی ہیں اور اِن کو اپنے مقاصد کو پورا کرنے تک متحد رہنے کی صدائیں دے رہی ہیں......!! (سفید ہاتھی)

اور جب ڈاکٹر توحیدی کشمیر کے موجودہ دردو کرب کی باتیں کرتے ہیں تو پڑھنے والے کا وجود لرز لرز جاتا ہے۔

> ''پندرہ برس کا طالب علم گلستان خان جب بھی اس شبِ سُرخاب کی طوفانی طغیانی میں اپنی غمگین سوچ کو نیند کے تلخ سمندر میں ڈبونا چاہتا تھا تو

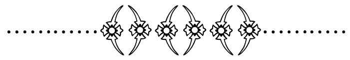
کالے پیڑوں کا جنگل.......کالے دیوؤں کا سایہ

ان ہی کرب زدہ لمحوں میں ان ستیزۂ چشم بھگت باز درندوں کی آگ برساتی گولیوں کا وہ دہشت ناک خونین منظر زلزلہ بن کر اُس کے نازک ذہن کی نازک سوچوں اور اس کے شیشۂ دل کے حسین سپنوں کو چکنا چور کر کے رکھ دیتا تھا، جس میں اس کے سامنے، دن کے اُجالے میں، اُس کے سولہا برس کے معصوم دوست بوستان شاہ کے نرم و نازک گلابی بدن کو سیاہ پوش درندوں کی زہریلی گولیوں نے پرزہ پرزہ کر کے رکھ دیا تھا اور اُس کا معصوم دوست موت کی گولیاں کھاتے کھاتے خون آلودہ ہاتھوں سے اپنے اسکولی بیگ سے کتابیں دکھا دکھا کر ان سنگ دل جلادوں کو اپنی بے گناہی کا نا کام وشواس دلا رہا تھا......!'' (سنگ باز)

میں ڈاکٹر ریاض توحیدی کو کشمیر کے افسانوی ادب کی دنیا میں استقبال کرتا ہوں......!

22 / فروری 2011 نور شاہ

سرینگر



تاثرات

پروفیسر حامدی کاشمیریؔ

ریاض توحیدیؔ نے تحقیق وتنقید پر سنجیدہ کام کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی تخلیقی حسیت کا افسانہ نویسی کی صورت میں اظہار کرنا شروع کیا ہے۔ وہ ایک طرح سے مابعد جدیدیت کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ مابعد جدیدیت کے اثرات اردو ادب میں افسانے کے ساتھ ساتھ شاعری میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔۱۹۸۰ء سے لیکر جدید دور میں جدیدیت کے ردعمل کے طور پر مابعد جدیدیت کو فروغ ملنے لگا۔ مابعد جدیدیت کوئی فلسفہ یا نظریہ نہیں ہے۔ اس دور میں سانس لینے والے نو واردانِ ادب، اس انسانی صورت حال کا سامنا کرتے ہیں جس میں سیاست، چنگیزیت میں تبدیل ہورہی ہیں۔ چنانچہ مقامی سطح پر اقدار شکنی، خوابوں کی شکست، رومانیت کی نفی کے علاوہ عالمی سطح پر ظلم وتشدد، اغوا کاری، ذاتی مفاد اور ملکی مفاد کے درمیان ٹکراؤ کی جو صورت حال ہے اس کے اثرات موجودہ عہد کے ادیب کے ضمیر اور دل ودماغ پر چھائے ہوئے ہیں اور اس کا اظہار وہ اپنی تحریر میں کرتا ہے۔

نئی نسل، جس کی نمائندگی ریاض توحیدیؔ کرتے ہیں، گہرے شعور اور فکر ونظر کی تازہ کاری کے اوصاف کی حامل ہیں۔ توحیدیؔ کی انفرادیت اس بات میں پوشیدہ

ہے کہ وہ ''زہر ہلاہل کو قند'' کی صورت عطا کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ بقول علامہ اقبالؔ ؎

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

گردوپیش کے ماحول میں لوگوں کو جس ظلم وتشدد سے گزرنا پڑا ہے اس کی تصویریں ریاض توحیدیؔ اپنے افسانوں میں پورے خلوص، دردمندی اور دکھ کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ان پر حقیقت نگاری کا اسلوب حاوی نہیں، وہ جانتے ہیں کہ فن کے رموز کیا ہیں اور وہ ان کو اچھی طرح لفظوں میں منتقل کرتے ہیں۔ ریاض توحیدیؔ کو زبان و بیان پر پورا عبور حاصل ہے۔ وہ افسانے کے واقعات کو بہت حد تک فرضیت میں مبدل کرتے ہیں اور یہی ان کی افسانہ نگاری کی پہچان ہے۔

چند باتیں

اُردو افسانے کا تاریخی سفر ایک صدی سے زائد عرصے پر پھیلا ہوا ہے۔اس سفر کی کامیابی کا ایک بین ثبوت یہ بھی ہے کہ عصر حاضر تک اُردو کے کئی ایسے افسانے بھی ادبی منظر نامے پر آتے رہے جنہیں عالمی سطح کے شاہکار افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔افسانے کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں۔اصل بات تو یہ ہے کہ افسانہ نگار زندگی کے کسی بھی پہلو سے متاثر ہو کر افسانہ لکھنے کی تحریک پاتا ہے۔چند ناقدین کی رائے میں افسانہ زندگی اور زمانہ سے کشید کیا ہوا ایک تخلیقی سچ ہوتا ہے تو اس توضیح کا خیال رکھتے ہوئے ایک افسانہ نگار زندگی کی حقیقت کو تخلیقی سچائی کے ساتھ پیش کرنے سے کیوں کترائے۔اردو کے بیشتر افسانوں میں سچائی کو خاموشی کے غلاف میں چھپایا جا رہا ہے اور ظالم کے ظلم اور مظلوم کی مظلومیت دونوں سچائیوں کو خاموشی کے قالب میں بند کیا گیا ہے۔جس تحریر سے قاری کی سوچ میں بدلاؤ نہیں آئیگا، انقلاب نہیں آئیگا وہ تحریر اثر پذیر قوت سے محروم رہ جاتی ہے۔اردو میں آج بھی ایسے افسانوں کی ضرورت ہے جنہیں پڑھ کر قاری انقلابی فکر سے آشنا ہو جائے۔بقول شاعر ؎

ہمیں تو اپنے دور میں اک انقلاب چاہیے

جو حوصلوں کا درس دے وہی کتاب چاہیے

میں سمجھتا ہوں کہ جب ظالم کا تیشہ مظلوم کے ننگے بدن پر وار کرتا ہے تو وار سہتے سہتے مظلوم کے دل سے جو پرشور آواز نکلتی ہے وہ آواز ہمارے افسانوں میں بھی سنائی دینی چاہیے۔ افسانے میں اشاروں کنایوں میں بات کرنا تو ٹھیک ہے لیکن سچائی کو بیان کرتے کرتے مصلحت پسندی سے کام لینا میری فطرت کے خلاف ہے کیونکہ میں لنگور کو انگور بنا کر پیش نہیں کرسکتا۔

عصرِ حاضر کے انسان کی سوچ وقت کی مٹھی میں قید ہو چکی ہے۔ وقت کی تیز رفتاری نے اس کے ذہن میں مرضی کے تصور کو غائب کر ڈالا ہے۔ زندگی مصروفیات کی یلغار میں اس طرح پھنس چکی ہے کہ انسان فرصت کے لمحات کو بھی ترجیحات میں تقسیم کرنے پر مجبور نظر آ رہا ہے۔ زندگی کی بدلتی ہوئی صورت حال سے قاری کے مزاج میں تبدیلی واقع ہوئی ہے اور وہ بھی اب اپنے ذوقِ مطالعہ کی تسکین کاری کیلئے وہی تحریر پسند کرتا ہے جو اُسے کم وقت بھی زیادہ تسکین بہم پہنچائے۔ اسی تصور کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب میں کوئی افسانہ لکھنے بیٹھتا ہوں تو لکھنے کے دوران میں افسانے کو غیر ضروری خیالات کی بھرمار سے بچانے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ افسانے لکھتے وقت میری سوچ کو قاری کی سوچ کا بھی خیال رہتا ہے تا کہ میرا افسانہ صرف

افسانہ ہی نہ رہے بلکہ قاری کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کا کماحقہ حق بھی ادا کر سکے۔'' کالے دیوؤں کا سایہ'' کے نام سے میں اپنا دوسرا افسانوی مجموعہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ میرا پہلا افسانوی مجموعہ ''کالے پیڑوں کا جنگل'' ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا ہے۔ مذکورہ مجموعے کے تعلق سے بہت سے قارئین نے راقم کو اپنے اپنے تاثرات سے نوازا اور چند اہل علم کے تبصرے بھی مختلف اخبار ورسائل میں شائع ہوتے رہے، جن میں جناب نور شاہ، جناب پروفیسر محمد اسلم، جناب زاہد مختار، جناب منظور احمد خان اور جناب شفیع احمد ڈار وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ راقم الحروف ان تمام اہل علم ودانش کے خلوص بھرے جذبات کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہے۔ علاوہ ازیں' میں پروفیسر قدوس جاوید صاحب کا ممنون ہوں کہ ان کے دانشورانہ خیالات سے کتاب کی اہمیت میں اضافہ ہوا.

پروفیسر حامدی کاشمیری صاحب کا میں خاص طور سے مشکور ہوں کہ موصوف نے علیل ہونے کے باوجود میرے اس مجموعے کو اپنے زریں خیالات سے نوازا۔

''کالے دیوؤں کا سایہ'' قارئین کرام کے ہاتھوں میں ہے۔ امید کرتا ہوں کہ معزز قارئین مطالعہ کرنے کے بعد راقم کو اپنے مفید مشوروں سے نوازیں گے۔

شکریہ

طالب راہ

ریاض توحیدی

کالے دیوؤں کا سایہ

پروفیسر قدوس جاوید
(شعبہ اردو، سنٹرل یونیورسٹی کشمیر)

اُردو میں شعر وادب کی تخلیق ....دنیا کی نہ جانے کتنی بستیوں میں ہورہی ہے، لیکن کشمیر کے ادیبوں اور شاعروں کا امتیاز یہ ہے کہ وہ صرف ادب نہیں لکھتے، ادب کے حوالے سے اہم عصری تناظرات (Contemporary Context) کو جینے کی کوشش بھی کرتے ہیں اور یہ تو ماننا ہوگا کہ ہر سچا قلم کار اپنے معاشرہ، اپنی ثقافت سے وابستہ رہ کر ہی پوری ایمانداری کے ساتھ اپنی زمین میں اپنے ادب کے تقاضے پورے کرتا ہے۔ چناچہ کشمیر کے ادیب خواہ وہ کشمیری میں لکھتے ہوں یا اُردو میں یا پنجابی، پہاڑی، گوجری اور لداخی کسی بھی زبان میں ان کی شناخت کا بنیادی نقطہ ہی یہ ہے کہ ان کی تحریروں سے کسی نہ کسی زاوئے سے اپنی زمین اور تہذیب کی گنگناہٹ لازمی طور پر سنائی دیتی ہے۔ جب ہم کشمیر میں اُردو افسانہ کے مزاج کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نور شاہ، عمر مجید اور خالد حسین سے لے کر مشتاق مہدی، شیخ عبدالرشید، غلام نبی شاہد، ایثار کشمیری اور ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی قادری تک اور اس کے ساتھ کی نسل کے ابھرتے ہوئے افسانہ نگار ریاض توحیدی کے افسانوں میں بھی کشمیر کے عصری حالات وحقائق کو عمدہ فنی اور

جمالیاتی دروبست کے ساتھ جینے کا عمل ملتا ہے۔ ریاض توحیدی کو تحقیق وتنقید سے بھی دلچسپی ہے۔ اب تک ان کے بیسوں مضامین اورافسانے معیاری رسائل اورنیٹ سائٹوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

ریاض توحیدی کو اقبالیات سے خصوصی شغف ہے۔ علاّمہ اقبالؔ کے فکروفن پر ان کی تصنیف ۲۰۱۰ء ''جہانِ اقبالؔ'' کے نام سے شائع ہوکر عوام وخواص سے داد تحسین حاصل کر چکی ہے۔ مشہور اقبالؔ شناس ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے حوالے سے ریاض توحیدی کا تازہ ترین تحقیقی وتنقیدی کارنامہ ''ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم بحیثیت اقبالؔ شناس'' یقینی طور پر اقبالیات کے باب میں ایک اضافے کا حکم رکھتا ہے۔
ریاض توحیدی تخلیقی صلاحیتوں سے بھی مالا مال ہیں جس کا اظہار انہوں نے صنفِ افسانہ میں کمال پختگی کے ساتھ کیا ہے۔ ریاض توحیدی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''کالے پیڑوں کا جنگل'' (۲۰۱۱ء) میں شائع ہوا جس کی پذیرائی اُردو حلقے میں بڑے پیمانے پر ہوئی۔ اب ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ''کالے دیووں کا سایہ'' شائع ہو چکا ہے۔ اس مجموعے کا پیش لفظ کشمیر کے مشہور نقاد پروفیسر حامدی کاشمیری نے لکھا ہے' حامدی کاشمیری کے مطابق:

''گرد وپیش کے ماحول میں لوگوں کو جس ظلم وتشدد سے گذرنا پڑا ہے اس کی تصویریں ریاض توحیدی اپنے افسانوں میں پورے خلوص دردمندی اور دُکھ کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔''

خود ریاض توحیدی نے افسانہ میں حق گوئی پر مبنی سماجی وابستگی کو لازمی قرار دیا ہے۔ اپنے مجموعے ''کالے دیوؤں کا سایہ'' میں 'چند باتیں' کے عنوان سے صنف افسانہ اور اپنی افسانہ نگاری کے فکری اور تخلیقی رویوں کی وضاحت کرتے ہوئے خود لکھا ہے:

''میں سمجھتا ہوں کہ جب ظالم کا تیشہ مظلوم کے ننگے بدن پر وار کرتا

ہےتو وار سہتے سہتے مظلوم کے دل سے جو پرشور آ واز نکلتی ہے وہ آ واز ہمارے افسانوں میں بھی سنائی دینی چاہیئے۔ افسانے میں اشاروں، کنایوں میں بات کرنا تو ٹھیک ہے لیکن سچائی کو بیان کر تے ہوئے مصلحت پسندی سے کام لینا میری فطرت کے خلاف ہے کیونکہ میں لنگور کوانگور بنا کر پیش نہیں کرسکتا۔''

''کالے دیوؤں کا سایہ'' میں اٹھارہ افسانے ہیں۔ان افسانوں کے موضوعات' کشمیر کی خوں آشام صورتحال سے لیکر عالمی سطح کے خونچکاں واقعات پر مشتمل ہیں اور سبھی افسانوں کا مرکز توجہ ظالم وجابر ہاتھوں کے کالے کارنامے ہیں۔کسی بھی تخلیق میں تخلیق کار کے مقامی ماحول کی عکاسی ضرور نظر آتی ہے. توحیدی کے افسانوں میں بھی وادی کے مختلف علاقوں میں رونما ہونے والے خونچکاں واقعات اور عبرتناک مظالم ومسائل کی تصویر کشی اس طرح کی گئی ہے کہ یہ افسانے' گذشتہ دوڈھائی دہائیوں میں کشمیر اور کشمیریوں پر گزرنے والے عذاب کے زندہ اور متحرک مرقعے ثابت ہورہے ہیں۔اس مجموعے کے پہلے افسانے'' چھوڑ دو' میں کشمیر کے ان ہزاروں معصوم لوگوں کی بدنصیبی کی کہانی ستر سالہ ضعیف جبار

چاچا کے حوالے سے بیان کی گئی ہے جس کا اکلوتا نوجوان بیٹا نذیر خان اوراوراکلو تی نوجوان بیٹی شریفہ دونوں اپنے اپنے خوابوں کے ساتھ ظلم کا شکار ہوکر موت کا شکار ہوجاتے ہیں۔ جبار چاچا ان ہزاروں لوگوں کی طرح تنہائی کی زندگی جینے پر مجبور ہیں'جن سے حالات نے ان کی اولاد کو چھین لیا ہے۔

اسی طرح'' گلہ قصائی''میں افسانہ نگار نے بدی اور خودغرضی اور انسان دوستی کے غلبہ کو ایک ان پڑھ قصائی گلہ کے حوالے سے کہانی بنی ہے اور افسانہ کے بین السطور سے یہ حقیقت جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے کہ وادی کے اعلٰی تعلیم یافتہ طبقہ کے

ذمہ دار افراد خصوصاً ڈاکٹر وغیرہ اب اپنے فرائض منصبی کے تئیں نہ تو مخلص رہے نہ ذمہ دار، جو کشمیر کی روایتی اخلاقی اور انسانی روایات کے یکسر خلاف ہے۔ لیکن کشمیر کا وہ طبقہ جنہیں ان پڑھ اور پست ذہن مانا جاتا ہے ان کے دلوں میں کشمیر کی قابلِ فخر انسان دوستی کے چراغ ابھی بھی روشن ہیں۔ اسی لئے گلہ قصائی ڈاکٹر کی خودغرضی کے سبب اپنی بیٹی کی موت کا انتقام ڈاکٹر کی بیٹی کو گوشت میں زہر ملا کر ہلاک کر لینا چاہتا ہے، لیکن پھر اس پر اس کی نفسیات میں موجود انسانیت، اس کے انتقام کے وقتی جذبے پر حاوی ہو جاتی ہے اور وہ زہر ملا گوشت واپس لے کر ضائع کر دیتا ہے۔

دراصل کشمیر سے باہر کی دنیا کو آج بھی پوری طرح معلوم نہیں کہ اس چمن میں صیادوں نے گل وبلبل کے شکار کے لئے ایسے ایسے ہتھکنڈے استعمال کئے اور ایسی ایسی سازشیں رچی ہیں کہ کشمیر کے ایک طبقے کی سوچ اور فکر کی قوت جیسے سلب ہو کر رہ گئی ہے۔ اس اندوہناک صورت حال کی منظرکشی ''گمشدہ قبرستان'' اور ''خوف'' وغیرہ افسانوں میں دکھائی دیتی ہے۔

ریاض توحیدی کے کلیدی افسانے ''کالے دیوؤں کا سایہ'' میں امن و شانتی قائم کرنے کے ذمہ دار افراد اور اداروں کی جانب سے عام لوگوں کے ساتھ ہونے والے وحشیانہ سلوک کو بڑی سچائی سے استعاراتی وعلامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے اس افسانہ کے درج ذیل اقتباس پر غور کریں:

> ''پھاٹک کے سامنے مارے گئے کتوں کی بدبو سے جب کالے دیو تنگ آ گئے تو انہوں نے بستی کے لوگوں کو حکم جابری سنایا کہ وہ ان خون آلودہ کتوں کو اپنے اپنے کاندھوں پر اُٹھا کر دور کسی نالے میں پھینک دیں۔ بے بس لوگ حکم جابری کی تعمیل کرتے ہوئے کتوں کو کاندھوں پر اُٹھائے جا رہے تھے کہ اچانک انہیں مردوہ کتوں کے

ڈھیر میں ایک خوبصورت نوجوان کی لاش پر نظر پڑی۔ وہ خوف زدہ ہوکر ڈھیر سے پیچھے ہٹنے لگے۔ انہیں پیچھے ہٹتے ہی کالے دیو آگ بگولہ ہوکر چلانے لگے:

''سالے......! پیچھے کیوں ہٹے......؟ ان کتوں کو جلدی جلدی یہاں سے ہٹاؤ' ہوا میں بدبو پھیل رہی ہے۔''

''ان......ان میں ایک انسانی لاش بھی ہے۔'' ایک نوجوان لرزتی آواز میں بول پڑا۔

''اُس کو بھی یہاں سے دفع کرو اور ان کتوں کے ساتھ کسی نالے میں ڈال دو'' کالی غار سے ایک طنز آمیز آواز آئی۔''

''لیکن......!''

''سوال مت کرو، نہیں تو تو بھی کتے کی موت مرے گا' سالا'' ایک اور خوفناک آواز نوجوان کے کانوں سے ٹکرائی۔''

ریاض توحیدی کے افسانے میں عالمی مسائل کی حیران کُن منظر کشی جلوہ گر ہے۔ ۱۱/۹ کے بعد عالمی منظرنامے پر رونما ہورہے واقعات و حادثات کی تصویر کشی کرتے ہوئے موصوف ''سفید تابوت''''مشنِ القدّس'' اور ''ہائی جیک'' جیسے افسانوں میں گہرے شعور اور وسیع مشاہدے کے بل پر تہذیبی تصادم کے سازشی محرکات کو علامتی اسلوب کے توسط سے ایکسپوز کرتے نظر آرہے ہیں. افسانہ ''ہائی جیک'' میں ایک عام انسان کے نفسیاتی تناؤ کو سوچ کی ہائی جیک قرار دیتے ہوئے افسانہ نگار جمہوریت کی آڑ میں حیوانیت برپا کرنے والے چہروں کے پردے چاک کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دن بھر کی مصروفیات سے تھک ہار کر وہ رات کی تنہائی میں سچ اور جھوٹ کی جنگ کا نظارہ کرنا چاہتا ہے. نیوز چینل کا نمبر ریموٹ پر

دباتے ہی اسکرین پر فلیش نیوز آتی ہے:

''ڈرون کے حملے میں اسکول تباہ، درجنوں معصوم بچے موت کی آغوش میں۔''

''یہ دشت گردی ہے، حیوانیت کے شکار معصوم بچوں کے والدین کا احتجاج۔''

''نہیں... یہ اقدام دنیا میں امن بحال کرنے کے لئے ضروری ہے۔'' سفیر امن کا بیان۔

''ایک خوفناک دھماکے میں نیٹو کے درجن بھر فوجی ہلاک۔''

''یہ دہشت گردی ہے۔'' سفیر امن کا بیان ''جمہوریت کے دشمنوں سے ضرور بدلہ لیا جائیگا۔''

ریاض توحیدی کو اُردو افسانہ کی روایت، شعریات اور موضوعاتی اور اسلوبیاتی رویوں کی آگہی ہے، لہذا انہیں اپنی سوچ اور فکر اور تخلیقیت کے سرمایہ کو نہ صرف محفوظ رکھنا ہے بلکہ اسے اور زیادہ مضبوط و مستحکم بھی کرنا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو صرف کشمیر ہی نہیں اُردو کی عام بستیوں میں بھی بحیثیت افسانہ نگار ریاض توحیدی اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

....

کالے پیڑوں کا جنگل......کالے دیوؤں کا سایہ

(Review)

Oozing Wounds

Professor Muhammad Aslam

kale pedon ka jangal by Dr Riaz Tawheedi (published by Mezaan Publishers, Srinagar 2011; pp. 103; price ` 200) is a collection of twenty-one short stories written in simple but lucid Urdu. The stories are about Kashmir and on themes which are not unfamiliar to us. The author has taken pains to paint Kashmir and Kashmiri's agony by fictionalizing the reality that we have been witnessing for decades now. The title of the collection might appear abstract but when one goes through the stories, we realize that Dr Tawheedi has used an appropriate expression to highlight the plight and pathos that Kashmiris have gone through endlessly for ages now. The stories are about gruesome killings, mindless killers, the death of communal harmony, the agony that every one has been going through, the loss of honour and

dignity etc that all of us are confronted with.

Tawheedi does not talk of Kashmiri Muslims alone. He draws his characters from other communities as well, especially the Sikhs and the Kashmiri Hindus (Pandits). He wails for the loss of faith in each other; he mourns the death of composite culture and he laments over "what man has made of man" in Kashmir. "Home Land" (page 75) is the story of Kashmir in the nineties when the whole social fabric of Kashmir took an ugly turn in its history and dashed to the ground our age-old communal harmony and mutual trust. The story is about a Pandit family that leaves Kashmir because "our own people have sent us a message that we should leave as early as possible". The main protagonist, Som Nath, doesn't want to leave his birthplace but he can't help: "Even my heart is not ready to leave my birthplace, but when others in the sect left what will I do here alone?" (p. 76-77). Sardar Surjeet Singh and Abdullah Khan request him not to leave, but of no use. Surjeet Singh tries to convince Som Nath that even he was asked to leave but he refused: "We three [Som Nath, Abdullah Khan and Surjit Singh] will brace the coming storm". Nothing could stop

Som Nath from leaving the valley for a seemingly peaceful abode. It is only after some years that Abdullah Khan receives a letter from Som Nath which Surjit Singh reads for him. The letter is a tale of woes and hardships that Som Nath has faced: "I made a mistake that on the instigation of others I plunged my family into morass of difficulties. There you respect as well as safeguard our daughters and daughters-in-law! But, here, those who we believed to be our own see our daughters with lustful eyes and disrespect us every where by calling us migrants" (p. 78).

Som Nath's birthplace becomes an "Azad Land" (p. 81) because of the disrespect shown by Som Nath's son towards villagers. Prithvi, an army officer, lays cordon of the village and calls everybody out. He tells the people that they were responsible for their exodus and they torched their houses. He gives them one month notice to leave the village which was going to be their 'homeland'. Prithvi's talk pains all villagers and when his father's friend Abdullah Khan protests against the false allegations, Prithvi thrashes him with his gun. Seeing this, all villagers give a hue and cry. Among the people is Abdullah Khan's son, Ghaznavi,

who faces Prithvi and says, "You people cheated your birthplace and ran away breaking the age old brotherhood. You torched your own houses and sold them to us" (p. 80). Ghaznavi tell Prithvi that their ways are different now and after one month when Prithvi returns to the village, he finds it different from what he had seen earlier-armed men guarding the village and a sign board signaling 'Azad Land'. "Global Jhoot" (p. 16) is about against the American usage of terrorism that she has been using to hoodwink the entire world. "Gumshuda Sarmaya" (The Lost Wealth) is a pathetic tale of a father who has nobody to look after in his old age (p. 30) when he has spent the entire earning of his life on his children and now he needed help which was not there. He needs one lack rupees as fee for heart surgery which can be done only by Dr Arshad Khan, his son living in America. In sending him there, Gaffar Khan had taken a loan of fifty thousand rupees out of his GP Fund. When the officer asked him what he would keep for himself as he was retiring the next year, Gaffar Khan, had said, "Sir, my real wealth is my children" (p. 32). Dr Arshad did come from America, first, to operate on a minister's son because he

had paid two lac rupees in advance. The doctors asked Gaffar Khan to get money but he couldn't. His friend, Rajaz Ali, told him that he would get him money from Sakhawat Centre. Next day, when Rajab Ali tells him that Dr Arshad had agreed to operate on him. Not only that, he had also given a concession of fifty thousand rupees. This broke Gaffar Khan's heart and he wondered how a human being could turn into a beast in a foreign country (p. 33). Early in the morning, when the hospital employees entered the ward to take Gaffar Khan to the theater, they were sad to find his cold body lying on the bed.

kale pedon ka jangal is full of such tales that make one mourn the sad plight of Kashmir

. Dr Towheedi has a good command over the language. His book could be called a valued addition to the language-Urdu-which has long been abandoned by its owners. Kashmir has given it a good space and writers like Towheedi can make it live longer!

（The author teaches English at KU)

Greater Kashmir...14 march 2015

کالے پیڑوں کا جنگل......کالے دیوؤں کا سایہ

Kalay Paedou Ka Jungle

Book Review by Manzoor Ahmad Khan

'Kalay Paedou Ka Jungle' is a collection of twenty one stories featuring multiple themes shared by common people in every changing society. The stories portray different themes including the challenges to social values, social fabric, mutual trust, acceptability, tolerance, humanism etc, which seem changing the definitions and codes with every passing day.

The compilation of stories depicts the onslaught of modernism and modernity and traces the little nuances of old socio-cultural ethos and values. In almost every story, the plot construction is technically rhythmic while the composition is sequential with open narrative account. Presentation is good and proper arrangements of events in time and space while as valid historical information is brought into use to arouse and sustain curiosity among the readers.

Literary tools employed enrich and provide multiple dimensions to these stories as the author, it is very much evident, has taken great pains to be able to provide a vision of occasions in simple and meaningful sequence. Human needs and passions are composed in a natural manner avoiding any artificiality to creep in.

Almost all the stories establish lifelikeness and win readers attention and willingness to accept the world as is portrayed. Physical and psychological insights essential to the stories are created along with effective mood while as locale and local color tastefully ensure and impart multiple dimensions and authenticity to the stories. Word pictures and strokes are economical and evocative as well.

Information given in the stories reveal atmosphere of pain and deprivation brought out, quite alive, by the minimum use of words highlighting the thwarted expectations of crippled son in 'Maa' (Mother) and the Post Man (who is Father) in Gumshudah Sarmaya (The Lost Wealth) resulting in tension and trauma.

In Safeed Hathi (White elephant), a metaphor of cultural aggression, the author depicts the devastated social fabric, communal harmony, mutual trust etc by suggesting barbaric trample of age old relations based on mutual respect, understanding and brotherhood.

In most of the stories first person narration is opted which adds credibility, immediacy and closeness of life. Narrator, many times, seems lost in the characters perception of the world where reader completely feels proximity of identify with the narrators vision abandoning his own critical intelligence and finally escapes in the characters life. In some stories narrator's perception is limited and one sided as in Safeed Hathi as he blocks the very new aspects, trends and chances of progress and prosperity existent in developed and developing societies.

In other stories third person narration is adopted which provides leisure and choice, to the author, to move back and forth and act as omniscient narrator. Author's prominent choice of figurative language adds meaning and dimension to the stories by and large. White elephant

"Safeed Hathi" is an allegory in which characters and events stand for norm and ideas, moral qualities and abstractions. Allusion and antithesis as in Tootti Jawanian (broken youthfulness) enrich local themes. Coherence and exactness is significant in all stories and conflict adds to these tragedies. Didactic and euphemism provides richness to the exposition of these stories and artistic excellence.

Foil, genre, images and imageries expand the themes of the stories while pathos emerges, legitimately and naturally from characters, situations and verisimilitude adds color and effect to it. Goomshuda Sarmaya (Lost Wealth) is a scathing comment on western emancipation and oriental indolence. It reminds me of an English story "The only American from our village" written by "Arun Joshi". The theme of the story is all in the title and yet the plot, scene depiction, language, character and atmosphere differ.

However eastern social expectations get crushed and shattered by the indolence of their sons, though, for their education and high status, they leave no stone unturned.

Social destruction, cultural and communal break down and gruesome killings at the hands of oppressive administrative forces and apparently well wishers in the name of nationalism, democracy, progress, and prosperity is core reflection of the book. Title of the book is symbolic and metaphoric suggesting the themes of the book which, otherwise, might seem vague.

This book is a historical manuscript for coming generation and a valued addition to Urdu literature. Professor Mohd Aslam Mir has well remarked that Dr. Reyaz Tawheedi has good command over language. His book could be called a valued addition to the Urdu language.

(Rising kashmir)

کوائف

نام	:	ڈاکٹر ریاض احمد بٹ
قلمی نام	:	ڈاکٹر ریاض توحیدیؔ
پیشہ	:	لیکچرار(محکمہ تعلیم جموں وکشمیر)
پیدائش	:	یکم دسمبر 1973ء
موبائیل	:	7006544358
ای میل	:	drreyaztawheedi777@yahoo.com
پتہ	:	وڑی پورہ ہندوارہ کشمیر193221(انڈیا)
تعلیم	:	گریجویشن : 1999ءگورنمنٹ ڈگری کالج ہندوارہ
	:	ایم،اے(اردو) : 2002ءشعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی
	:	ایم، فل : 2004ءاقبالؔ انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی
	:	پی،ایچ،ڈی: 2007ءاقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی
ایوارڈ	:	گولڈمیڈل: 2009ء(اقبالیات)
تصانیف	:	(۱)جہان اقبالؔ(تحقیق،تنقید) ________ 2010

(۲) کالے پیڑوں کا جنگل(افسانے)____2011

(۳) ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم بحیثیت اقبالؔ شناس (تحقیق وتنقید). پہلا ایڈیشن3 201ءکشمیر.. دوسرا ایڈیشن2018پاکستان

(۴) کالے دیوؤں کا سایہ(افسانے)____2014ء

(۵) معاصراردوافسانہ تفہیم وتجزیہ(تنقید)2019ء

شائع شدہ مضامین/افسانے: رسائل/ویب سائٹس/اخبارات

ایوان اردو(دہلی)'اقبالیات(کشمیر یونیورسٹی)' بازیافت(کشمیر یونیورسٹی)' تحریرنو(ممبی)تحریک ادب(وارانسی)' لفظ لفظ(کشمیر)'اردو اکادمی(کشمیر) نگینہ(کشمیر)احساس(جرمنی)صبح نو (پاکستان)'ندائے گل (پاکستان)' قرطاس (برطانیہ)ثالث(پٹنہ بہار)فنون((مہاراشٹرا)' کشمیر عظمیٰ(کشمیر)' دبستان ادب(پاکستان) ادب وثقافت(امریکہ)' زبان وادب(بہار اردو اکادمی)' انشا(انڈیا)' آج کل(دہلی)' تریاق(مہاراشٹر)

وابستگی : اردو افسانے۔کام'اردو نیٹ جاپان۔کام۔کاروان اردو۔کام'اردو دوست۔کام' حقائق انٹرنیشنل۔کام'اردو دوست۔کام۔ پروگریسیو رائٹرس گروپ' عالمی اردو فکشن۔ انہماک۔کام۔عالمی اردو فکشن۔کام۔اردو اکاڈمی جموں وکشمیر'جموں اینڈ کشمیر فکشن رائیٹرس گلڈ'جموں و کشمیر کلچرل اکادمی۔۔۔'عالمی اردو افسانہ فورم.کام'اردو دوست ۔کام' اردو افسانے۔کام 'اردو فکشن ۔کام

....

Published Work-Articles/Fiction

مضامین	رسائل
(۱)ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم بحیثیت اقبال شناس	ایوانِ اردو-اردو اکادمی دہلی R.N.No-4593 8/87۔جون ۲۰۰۷ء
(۲)کشمیر میں اقبال شناسی	بازیافت،شعبہ اُردو کشمیر یونیورسٹی ۲۰۰۷ء
(۳)پیام اقبال، نالۂ مرغ سحر	اقبالیات، اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی ۲۰۰۷ء ISSNo 975-6604
(۴)پروفیسر حامدی کاشمیری بحیثیت اقبال شناسی	شیرازہ، کلچرل اکادمی سرینگر کشمیر ۲۰۰۷ء
(۵)اقبال کا پیام تحریک	صدا، کلچرل سوسایٹی آف انڈیا ۲۰۰۷ء

(۶)اقبآل کے کلام میں قرآنی فکر الحیات،کشمیر ۲۰۰۷ء
(۷)پروفیسر حامدی کاشمیری کی اقبآل شناسی فنون،مہاراشٹر۔ اگست ۲۰۰۷ء
(۸)اقبال فہمی میں محمد بدیع الزمان کی انفرادیت اقبالیات،اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی ۲۰۰۷ء
ISSNo 975-6604
(۹)ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم(کلام اقبآل کا معتبر مبصر) اقبالیات،اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی ۲۰۱۱ء
ISSNo 975-6604
(۱۰)تصورِعشق کی جہتیں۔۔اقبآل جہانِ اردو دردبھنگہ بہار۔اپریل تا دسمبر ۲۰۰۹ء
(۱۱)آزاد قیدی۔۔آزاد سوچ کی عکاس تحریک ادب۔وارانسی۔یوپی۔شمارہ(۸)۲۰۱۲ء
(۱۲)پربتی سوچ کے مالک،فرید پربتی تریاق،ممبی۔نومبر ۲۰۱۲ء
(۱۳)جموں وکشمیر میں اقبآل شناسی اقبالیات۔اقبآل انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی۔۲۰۱۲ء
(۱۴)کشمیر کے معاصر اردو افسانوں کے تخلیقی روّیے۔ ثالث۔پٹنہ بہار۔۲۰۱۴ء۔
(۱۵)علامتی افسانہ،تخلیقی مضمرات ثالث۔پٹنہ.بہار... ۲۰۱۷ء
(۱۶)نورشاہ کشمیر کہانی کے آئینے میں تحریرنو ممبئ ۲۰۱۷
(۱۷)بائیں پہلو کی پسلی(احمد رشید علیگ) شیراز جموں وکشمیر کلچرل اکاڈمی ۲۰۱۷

افسانے	رسائل
(۱)کالے پیڑوں کا جنگل	ماہنامہ "لفظ لفظ" کشمیر جولائی ۲۰۰۹ء
(۲)ناکہ بندی	ماہنامہ "حکیم الامت" کشمیر ستمبر ۲۰۰۹ء
(۳)ڈپریشن	ماہنامہ "لفظ لفظ" کشمیر ستمبر ۲۰۰۹ء
(۴)سفید ہاتھی	ماہنامہ "تحریرنو" ممبئ انڈیا اپریل ۲۰۱۰ء

(۵) تیسری جنگ عظیم سے قبل	ماہنامہ "لفظ لفظ" ۲۰۱۰ء
(۶) جیب کترا	ماہنامہ "لفظ لفظ " شخصیات نمبر مارچ ۲۰۱۱ء
(۷) رحمت کے پھول	ماہنامہ "لفظ لفظ" شخصیات نمبر مارچ ۲۰۱۱ء
(۸) ماں	تحریک ادب وارانسی، یوپی۔شمارہ ۱۴ ۲۰۱۱ء
(۹) زندگی کا بازار	انشاء کولکاتہ جولائی اگست ۲۰۱۲ء
(۱۰) کالے دیوؤں کا سایہ	تریاق ممبئی انڈیا نومبر ۲۰۱۲ء
(۱۱) ناقوس واذان	امنگ۔اُردو اکادمی دہلی اپریل ۲۰۱۲ء
(۱۲) کالے دیوؤں کا سایہ	انشاء ۔کولکاتہ ISSN: 0471-6009 مارچ-اپریل ۲۰۱۳ء
(۱۳) کالے دیوؤں کا سایہ	صبح نو۔پاکستان ۲۰۱۴ء
(۱۴) دوشالہ	شیرازہ۔جموں وکشمیر کلچرل اکادمی ۲۰۱۴ء
(۱۵) مشترکہ میراث	زبان وادب بہار اردو اکادمی ۲۰۱۶ء
(۱۶) ماں	ادب وثقافت انٹرنیشنل۔(امریکہ) ۲۰۱۶ء
(۱۷) سفید کبوتر	سہ ماہی ''قرطاس'' برطانیہ ۲۰۱۷ء
(۱۸) ڈپریشن	ندائے گل (پاکستان) ۲۰۱۸ء
(۱۹) عید مبارک	لفظ لفظ کشمیر ۲۰۱۸ء
(۲۰) سفید کبوتر	نگینہ کشمیر

....

Dr Reyaz Tawheedi

Address;Wadipora Handwara Kashmir 193221(India)

Mob.7006544358....9906834877

E.mail:drreyaztawheedi777@yahoo.com

کالے پیڑوں کا جنگل.......کالے دیوؤں کا سایہ